اسلامی اصول کی فلاسفی
الشرکۃ الاسلامیۃ لمیٹڈ ربوہ

باسمہٖ سبحانہٗ

اسلامی اصول کی فلاسفی

از قلم

حضرت مرزا غلام احمد بانیٔ جماعتِ احمدیہ علیہ السّلام

الناشر

الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ ربوہ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتابت کی غلطیوں کے متعلّق ضروری گذارش

سہو و نسیان سے انبیاء تک مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں:۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اَنْسٰی کَمَا تَنْسَوْنَ۔ (بخاری)

یعنی مَیں بھی تمھاری طرح کا ایک انسان ہوں اور کبھی کبھی بھول جاتا ہوں جیسے تم بھول جاتے ہو۔

اِسی طرح حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ اپنی کتاب "ایام الصّلح" میں فرماتے ہیں مَیں بشر ہوں اور بشریّت کے عوارض مثلاً سہو و نسیان دُوسرے انسانوں کی طرح مجھ میں بھی ہیں۔

اِس لئے حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ کی کتابوں میں کتابت کی غلطیوں یا سہو و نسیان کی غلطیوں کا پایا جانا قابلِ تعجّب نہیں ہے۔ لیکن آپ کی تحریروں اور کتابوں کو شائع کرنے کے لئے ہمارا اصول یہ ہے۔ کہ جس صورت میں حضورؑ کے سامنے اور حضور کی نگرانی میں چھپنے والی کتاب چھپ گئی۔ اس کے الفاظ کو بعد میں محض اپنے قیاس سے بدلنا درست نہیں۔ کیونکہ اس سے آہستہ آہستہ تحریف کا دروازہ کُھل سکتا ہے جو کسی طرح جائز نہیں۔ البتّہ اگر کسی کتاب میں قرآن شریف کی کوئی آیت یا حدیثِ نبویؐ کا کوئی حصّہ

کاتب کی غلطی سے غلط چھپ گیا ہے تو اُسے درست کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جس کی تصحیح کے لئے ہمارے پاس ایک یقینی اور قطعی ذریعہ موجود ہے ؛

ہم نے قارئین کی سہولت کے لئے حاشیہ میں قرآنی آیات کے حوالجات دے دئے ہیں۔ ان میں پہلا عدد سورت کا ہے اور دوسرا آیت کا۔ اور جہاں پ اور ع لکھا ہے وہاں پارہ اور رکوع مراد ہے ؛

اس کتاب کے بہت سے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت صحیح تعداد کا اندازہ لگانا ہمارے لئے مشکل ہے۔ مگر الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ نے اسے پہلی بار ۱۹۵۴ء میں شائع کیا تھا۔ اور دوسری بار ۱۹۵۸ء میں اب تیسری بار ۱۹۶۲ء میں عکسی طور پر شائع کیا جا رہا ہے ؛

جلال الدین شمس

ناظر اصلاح و ارشاد و انچارج تالیف و تصنیف صدر انجمن احمدیہ

پاکستان

دسمبر ۱۹۶۲ء

پیش لفظ

ایک صاحب سوامی سادھو شوگن چندر نامی جو تین چار سال تک ہندوؤں کی کائستھ قوم کی اصلاح و خدمت کا کام کرتے رہے تھے۔ اُنھیں ۱۸۹۲ء میں خیال آیا کہ جب تک سب لوگ اکٹھے نہ ہوں کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ آخر اُنھیں ایک مذہبی کانفرنس کے انعقاد کی تجویز سُوجھی۔ چنانچہ اس نوعیّت کا پہلا جلسہ اجمیر میں ہؤا۔ اس کے بعد وہ ۱۸۹۶ء میں دُوسری کانفرنس کے لئے لاہور کی فضا کو موزوں سمجھ کر اس کی تیاری میں لگ گئے[1]۔

سوامی صاحب نے اس مذہبی کانفرنس کے انتظامات کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس کے پریذیڈنٹ ماسٹر دُرگا پرشاد اور چیف سکرٹری چیفکورٹ لاہور کے ایک ہندو پلیڈر لالہ دھنپت رائے بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی تھے ؎

کانفرنس کے لئے ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ دسمبر ۱۸۹۶ء کی تاریخیں قرار پائیں۔ جلسہ کی کاروائی کے لئے مندرجہ ذیل چھ موڈریٹر صاحبان نامزد کئے گئے :۔

(۱) رائے بہادر بابو پرتول چند صاحب جج چیفکورٹ پنجاب۔

---

[1] رپورٹ جلسۂ اعظم مذاہب صفحہ ۲۵۳ و ۲۵۴ مطبوعہ مطبع صدّیقی لاہور ۱۸۹۷ء ؎

(۲) خان بہادر شیخ خدا بخش صاحب جج سمال کاز کورٹ لاہور۔
(۳) رائے بہادر پنڈت رادھا کشن صاحب کول پلیڈر چیفکورٹ سابق گورنر جموں
(۴) حضرت مولوی حکیم نور الدین صاحب طبیب شاہی۔
(۵) رائے بھوانی داس صاحب ایم۔ اے، ایکسٹرا سیٹلمنٹ آفیسر جہلم۔
(۶) جناب سردار جواہر سنگھ صاحب سیکرٹری خالصہ کمیٹی لاہور۔
سوامی شوگن چندر صاحب نے جلسہ کا اشتہار دیتے ہوئے مسلمانوں، عیسائیوں اور آریہ صاحبان کو قسم دی کہ اُن کے نامی علماء ضرور اس جلسے میں اپنے اپنے مذہب کی خوبیاں بیان فرمائیں ؎

اور لکھا کہ جو جلسۂ اعظم مذاہب کا بمقام لاہور ٹاؤن ہال قرار پایا ہے جس کی تاریخیں ۲۶-۲۷-۲۸ دسمبر مقرر ہو چکی ہیں اس کی اغراض یہی ہیں کہ سچے مذہب کے کمالات اور خوبیاں ایک عام مجمع مہذبین میں ظاہر ہو کر اسکی محبت دلوں میں بیٹھ جائے اور اُسکے دلائل و براہین کو لوگ بخوبی سمجھ لیں اور اسطرح ہر مذہب کے بزرگ واعظ کو موقع ملے کہ وُہ اپنے مذہب کی سچائیاں دوسروں کے دلوں میں بٹھا دے۔ اور سننے والوں کو بھی یہ مبارک موقع حاصل ہو کہ وُہ ان سب بزرگوں کے مجمع میں ہر ایک تقریر کا دُوسرے کی تقریر کے ساتھ موازنہ کریں اور جہاں حق کی چمک پاویں اُس کو قبول کر لیں ؎

اور آجکل مذاہب کے جھگڑوں کی وجہ سے دلوں میں سچے مذہب کے معلوم کرنے کی خواہش بھی پائی جاتی ہے اور اس کے لئے احسن طریق بھی یہی

لہ رپورٹ جلسۂ اعظم مذاہب۔

معلوم ہوتا ہے کہ تمام بزرگانِ مذہب جو وعظ اور نصیحت اپنا شیوہ رکھتے ہیں ایک مقام میں جمع ہوں اور اپنے اپنے مذہب کی خوبیاں سوالاتِ مشتہرہ کی پابندی سے بیان فرمائیں۔ پس اِن مجمعِ اکابرِ مذہب میں جو مذہب سچے پرمیشور کی طرف سے ہوگا ضرور وُہ اپنی نمایاں چمک دکھلائے گا۔ اِسی غرض سے اس جلسہ کی تجویز ہوئی ہے۔ اور ہر ایک قوم کے بزرگ واعظ خُوب جانتے ہیں کہ اپنے مذہب کی سچائی ظاہر کرنا اُن پر فرض ہے پس جس حالت میں اس غرض کے لئے یہ جلسہ انعقاد پایا ہے کہ سچائیاں ظاہر ہوں تو خُدا نے ان کو اِس غرض کے ادا کرنے کا اب خوب موقع دیا ہے جو ہمیشہ انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔

پھر اُنھیں ترغیب دیتے ہوئے لکھا کہ مَیں یہ قبول نہیں کر سکتا کہ

"جو شخص دُوسرے کو ایک مہلک بیماری میں خیال کرتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اس کی سلامتی میری دوا میں ہے اور بنی نوع کی ہمدردی کا دعویٰ بھی کرتا ہے وُہ ایسے موقع میں جو غریب بیمار اس کو علاج کے لئے بلاتے ہیں وُہ پہلو تہی کرے۔ میرا دل اس بات کے لئے تڑپ رہا ہے کہ یہ فیصلہ ہو جائے کہ کون سا مذہب درحقیقت سچائیوں اور صداقتوں سے بھرا ہُوا ہے۔"

مختلف مذاہب کے نمائندوں نے مذہبی کانفرنس میں شمولیت کیلئے دعوت قبول کی اور دسمبر ۱۸۹۶ء میں بڑے دِن کی تعطیلات میں بمقام لاہور ایک جلسۂ اعظم مذاہب منعقد ہُوا جس میں مختلف مذاہب کے ان نمائندوں نے کمیٹی جلسہ کی طرف سے اعلان کردہ پانچ سوالوں پر تقریریں کیں جو کمیٹی کی طرف

سے بغرضِ جوابات پہلے شائع کر دیئے گئے تھے اور اُن کے جوابات کے لئے کمیٹی کی طرف سے یہ شرط لگائی گئی تھی کہ تقریر کرنے والا اپنے بیان کو حتّی الامکان اُس کتاب تک محدُود رکھے جس کو وُہ مذہبی طور سے مقدّس مان چُکا ہے ۔

سوالات یہ تھے :-

۱ ۔ انسان کی جسمانی ، اخلاقی اور رُوحانی حالتیں ۔
۲ ۔ انسان کی زِندگی کے بعد کی حالت یعنی عقبیٰ ۔
۳ ۔ دُنیا میں انسان کی ہستی کی اصل غرض کیا ہے اور وُہ غرض کس طرح پُوری ہو سکتی ہے ؟
۴ ۔ کرم یعنی اعمال کا اثر دُنیا اور عاقبت میں کیا ہوتا ہے ؟
۵ ۔ عِلم یعنی گیان اور معرفت کے ذرائع کیا کیا ہیں ؟

اِس جلسہ میں جو ۲۶ ، دسمبر سے ۲۹ ، دسمبر تک ہُوا سناتن دھرم ، ہندُوازم ، آریہ سماج ، فری تھنکر ، برہمُو سماج ، تھیوسوفیکل سوسائٹی ، ریلیجن آف ہارمنی ، عیسائیت ، اسلام اور سِکھ اِزم کے نمائندوں نے تقریریں کیں لیکن ان تمام تقاریر میں سے صرف ایک ہی تقریر ان سوالات کا حقیقی اور مکمّل جواب تھی ۔ جس وقت یہ تقریر حضرت مولوی عبد الکریم رضؓ سیالکوٹی نہایت خوش الحانی کے ساتھ پڑھ رہے تھے اُس وقت کا سماں بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ کسی مذہب کا کوئی شخص نہیں تھا جو بے اختیار تحسین و آفرین کا نعرہ بلند نہ کر رہا ہو ۔ کوئی شخص نہ تھا جس پر وجد اور محویت کا عالم طاری نہ ہو ۔ طرزِ بیان

نہایت دِلچسپ اور ہر دلعزیز تھا۔ اس سے بڑھکر اس مضمون کی خوبی کی اور کیا دلیل ہوگی کہ مخالفین تک عش عش کر رہے تھے۔ مشہور و معروف انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے باوجود عیسائی ہونے کے صرف اسی مضمون کی اعلیٰ درجہ کی تعریف لکھّی اور اسی کو قابلِ تذکرہ بیان کیا ؎

یہ مضمون حضرت میرزا غلام احمد صاحب قادیانی بانیٔ جماعتِ احمدیہ کا لِکھا ہُوا تھا۔ اس مضمون کے مقرّرہ وقت میں جو دو گھنٹہ تھا ختم نہ ہونے کی وجہ سے ۲۹ ر دسمبر کا دِن بڑھایا گیا۔ پنجاب آبزرور نے اِس مضمون کی توصیف میں کالموں کے کالم بھر دِئے۔ پیسہ اخبار۔ چودھویں صدی۔ صادق الاخبار۔ مُخبرِ دکن و جنرل و گوہر آصفی کلکتّہ وغیرہ تمام اخبارات بالاتفاق اِس مضمون کی تعریف و توصیف میں رطب اللّساں ہوئے۔ غیر اقوام اور غیر مذاہب والوں نے اِس مضمون کو سب سے بالاتر مانا۔ اس مذہبی کانفرنس کے سکرٹری دھنپت رائے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پلیڈر چیفکورٹ پنجاب کتاب "رپورٹ جلسۂ اعظم مذاہب" (دھرم مہوتسو) میں اِس تقریر سے متعلّق لکھتے ہیں :۔

"پنڈت گوردھن داس صاحب کی تقریر کے بعد نصف گھنٹہ کا وقفہ تھا۔ لیکن چونکہ بعد از وقفہ ایک نامی وکیل اسلام کی طرف سے پیش ہونا تھا اِس لئے اکثر شائقین نے اپنی جگہ کو نہ چھوڑا۔ ڈیڑھ بجنے میں ابھی بہت سا وقت رہتا تھا کہ اسلامیہ کالج کا وسیع مکان جلد جلد بھرنے لگا۔ اور چند ہی منٹوں میں تمام مکان پُر ہوگیا۔ اس وقت کوئی سات اور آٹھ ہزار

کے درمیان مجمع تھا۔ مختلف مذاہب وملل اور مختلف سوسائٹیوں کے معتدبہ اور ذی علم آدمی موجود تھے۔ اگرچہ کرسیاں اور میزیں اور فرش نہایت ہی وسعت کے ساتھ مہیا کیا گیا۔ لیکن صدہا آدمیوں کو کھڑا ہونے کے سوا اور کچھ نہ بن پڑا۔ اور ان کھڑے ہوئے شائقینوں میں بڑے بڑے رؤساء، عمائدِ پنجاب، علماء فضلاء، بیرسٹر، وکیل، پروفیسر، اکسٹرا اسسٹنٹ، ڈاکٹر غرض کہ اعلیٰ طبقہ کے مختلف برانچوں کے ہر قسم کے آدمی موجود تھے۔ اِن لوگوں کے اس طرح جمع ہو جانے اور نہایت صبر و تحمّل کے ساتھ جوش سے برابر پانچ چار گھنٹے اُس وقت ایک ٹانگ پر کھڑا رہنے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان ذیجاہ لوگوں کو کہاں تک اس تقدّس تحریک سے ہمدردی تھی۔ مصنفِ تقریر اصالتاً تو شریکِ جلسہ نہ تھے لیکن خود اُنھوں نے اپنے ایک شاگردِ خاص جناب مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹی مضمون پڑھنے کے لئے بھیجے ہُوئے تھے۔ اس مضمون کے لئے اگرچہ کمیٹی کی طرف سے صرف دو گھنٹے ہی تھے۔ لیکن حاضرینِ جلسہ کو عام طور پر اس سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی کہ موڈریٹر صاحبان نے نہایت جوش اور خوشی کے ساتھ اجازت دی کہ جب تک یہ مضمون ختم نہ ہو تب تک کاروائی جلسہ کو ختم نہ کیا جائے۔ اُن کا ایسا فرمانا عین اہلِ جلسہ اور حاضرینِ جلسہ کی منشار کے مُطابق تھا۔ کیونکہ جب وقتِ مقرّرہ کے گذرنے پر مولوی ابو یوسف مبارک علی صاحب نے اپنا وقت بھی اس مضمون کے ختم ہونے کے لئے دے دیا تو حاضرین اور موڈریٹر صاحبان نے ایک نعرۂ خوشی سے مولوی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ جلسہ کی کاروائی

ساڑھے چار بجے ختم ہو جانی تھی لیکن عام خواہش کو دیکھ کر کاروائی جلسہ ساڑھے پانچ بجے کے بعد تک جاری رکھنی پڑی۔ کیونکہ یہ مضمون قریباً چار گھنٹہ میں ختم ہوا اور شروع سے اخیر تک یکساں دلچسپی و مقبولیت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔"

عجیب بات یہ ہے کہ جلسہ کے انعقاد سے قبل ۲۱ر دسمبر ۱۸۹۶ء کو حضرت بانئ جماعتِ احمدیہ نے اپنے مضمون کے غالب رہنے کے متعلق اللہ تعالےٰ سے خبر پاکر ایک اشتہار شائع کیا جس کی نقل درجِ ذیل ہے:۔

سچّائی کے طالبوں کیلئے ایک عظیم الشّان خوشخبری

جلسۂ[ل] اعظم مذاہب جو لاہور ٹاؤن ہال میں ۲۶۔۲۷۔۲۸ر دسمبر ۱۸۹۶ء کو ہوگا۔ اُس میں اس عاجز کا ایک مضمون قرآنِ شریف کے کمالات اور مُعجزات کے بارے میں پڑھا جائیگا۔ یہ وہ مضمون ہے جو انسانی طاقتوں سے

ل سوامی شوگر چند صاحب نے اپنے اشتہار میں مسلمانوں اور عیسائی صاحبان اور آریہ صاحبوں کو قسم دی تھی کہ اُن کے نامی علماء اس جلسہ میں اپنے اپنے مذہب کی خوبیاں ضرور بیان فرماویں۔ سو ہم سوامی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں کہ ہم اس بزرگ قسم کی عزت کیلئے آپ کے منشاء کو پُورا کرنے کے لئے تیار ہوگئے ہیں اور انشاء اللہ ہمارا مضمون آپ کے جلسہ میں پڑھا جائیگا۔ اسلام وہ مذہب ہے جو خُدا کا نام درمیان آنے سے سچے مُسلمان کو کامل اطاعت کی ہدایت فرماتا ہے لیکن اب ہم دیکھیں گے کہ آپ کے بھائی آریوں اور پادری صاحبوں کو اپنے پرمیشر یا یسُوع کی عزّت کا کس قدر پاس ہے اور وُہ ایسے عظیم الشّان قدّوس کے نام پر حاضر ہونے کے لئے مستعد ہیں یا نہیں۔ منہ

برتر اور خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان اور خاص اسکی تائید سے
لکھا گیا ہے۔ اس میں قرآن شریف کے وہ حقائق اور معارف درج ہیں
جن سے آفتاب کی طرح روشن ہو جائیگا کہ درحقیقت یہ خدا کا کلام اور رب
العالمین کی کتاب ہے۔ اور جو شخص اس مضمون کو اوّل سے آخر تک پانچوں سوالوں
کے جواب سُنے گا میں یقین کرتا ہوں کہ ایک نیا ایمان اُس میں پیدا ہوگا
اور ایک نیا نور اُس میں چمک اُٹھے گا اور خدا تعالیٰ کے پاک کلام کی ایک
جامع تفسیر اس کے ہاتھ آجائے گی۔ میری تقریر انسانی فضولیوں سے پاک
اور لاف وگزاف کے داغ سے منزہ ہے۔ مجھے اِس وقت محض بنی آدم
کی ہمدردی نے اِس اشتہار کے لکھنے کے لئے مجبور کیا ہے۔ تا وہ قرآن شریف
کے حسن و جمال کا مشاہدہ کریں اور دیکھیں کہ ہمارے مخالفوں کا کس قدر ظلم ہے
کہ وہ تاریکی سے محبت کرتے اور نور سے نفرت رکھتے ہیں۔ مجھے خدائے
علیم نے الہام سے مطلع فرمایا ہے کہ یہ وہ مضمون ہے جو سب پر غالب آئے گا
اور اس میں سچائی اور حکمت اور معرفت کا وہ نور ہے جو دوسری قومیں بشرطیکہ
حاضر ہوں اور اسکو اوّل سے آخر تک سُنیں شرمندہ ہو جائیں گی اور ہرگز قادر
نہیں ہونگی کہ اپنی کتابوں کے یہ کمال دِکھلا سکیں خواہ وہ عیسائی ہوں، خواہ
سناتن دھرم والے یا کوئی اَور۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا ہے۔ کہ
اس روز اسکی پاک کتاب کا جلوہ ظاہر ہو۔ مَیں نے عالمِ کشف میں اسکے متعلق
دیکھا کہ میرے محل پر غیب سے ایک ہاتھ مارا گیا اور اس ہاتھ کے چھونے
سے اس محل میں سے ایک نور ساطع نکلا جو اردگرد پھیل گیا اور میرے ہاتھوں

پر بھی اسکی روشنی پڑی۔ تب ایک شخص جو میرے پاس کھڑا تھا۔ وُہ بلند آواز سے بولا اَللّٰہُ اَکْبَر خَرِبَتْ خَیْبَر۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس محل سے میرا دل مُراد ہے جو جائے نزول و حلول انوار ہے۔ اور وُہ نور قرآنی معارف ہیں اور خیبر سے مُراد تمام خراب مذہب ہیں جن میں شرک اور بدعت کی ملونی ہے۔ اور انسان کو خدا کی جگہ دی گئی۔ یا خدا کی صفات کو اپنے کامل محل سے نیچے گرا دیا ہے۔ سو مجھے جتلایا گیا ہے کہ اس مضمون کے خوب پھیلنے کے بعد جھُوٹے مذہبوں کا جھُوٹ کھل جائیگا اور قرآنی سچّائی دِن بدن زمین پر پھیلتی جائے گی جب تک کہ اپنا دائرہ پُورا کرے۔ پھر اس کشفی حالت سے الہام کی طرف منتقل کیا گیا اور مجھے یہ الہام ہوا اِنَّ اللّٰہَ مَعَكَ اِنَّ اللّٰہَ یَقُوْمُ اَیْنَمَا قُمْتَ یعنی خدا تیرے ساتھ ہے اور خُدا وہیں کھڑا ہوتا ہے جہاں تُو کھڑا ہو۔ یہ حمایت الٰہی کے لئے ایک استعارہ ہے۔ اب مَیں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ ہر ایک کو یہی اطلاع دیتا ہُوں کہ اپنا اپنا حرج بھی کرکے اِن معارف کے سُننے کے لئے ضرور بمقام لاہور تاریخِ جلسہ پر آویں کہ اُن کی عقل و ایمان کو اس سے وُہ فائدے حاصل ہونگے کہ وُہ گمان نہیں کرسکتے۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی ۔

خاکسار۔

غلام احمدؐ از قادیان

۲۱ر دسمبر ۱۸۹۶ء

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطورِ نمونہ دو تین اخبارات کی رائے ذیل میں درج کردی جائے :۔

اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ (لاہور) نے لکھا:۔

"اِس جلسہ میں سامعین کی دِلی اور خاص دِلچسپی میرزا غلام احمد قادیانی کے لیکچر کے ساتھ تھی جو اسلام کی حمایت و حفاظت میں ماہرِ کامل ہیں۔ اس لیکچر کو سُننے کے لئے دُور و نزدیک سے مختلف فرقوں کا ایک جم غفیر اُمڈ آیا تھا اور چونکہ مرزا صاحب خود تشریف نہیں لاسکتے تھے اس لئے یہ لیکچر اُن کے ایک لائق شاگرد منشی عبدالکریم صاحب فصیح سیالکوٹی نے پڑھ کر سُنایا۔ ۲۷ تاریخ کو یہ لیکچر تین گھنٹے ہوتا رہا اور عوام الناس نے نہایت ہی خوشی اور توجّہ سے اس کو سُنا۔ لیکن ابھی صرف ایک سوال ختم ہُوا مولوی عبدالکریم صاحب نے وعدہ کیا کہ اگر وقت ملا تو باقی حصّہ بھی سُنادوں گا۔ اِس لئے مجلس انتظامیہ اور صدر نے یہ تجویز منظور کرلی ہے کہ ۲۹ دسمبر کا دن بڑھا دیا جائے۔ (ترجمہ)

اخبار "چودھویں صدی" راولپنڈی } نے حضرتِ اقدس مسیحِ موعود علیہ السّلام کے اِس لیکچر پر مندرجہ ذیل تبصرہ لکھا:۔

"ان لیکچروں میں سے سب سے عُمدہ لیکچر جو جلسہ کی رُوحِ رواں تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا لیکچر تھا۔ جس کو مشہور فصیح البیان مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹی نے نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے پڑھا۔ یہ لیکچر دو دن میں تمام ہُوا۔ ۲۷ دسمبر تقریبًا چار گھنٹے اور ۲۹ دسمبر کو دو گھنٹے تک ہوتا رہا۔ کُل چھ گھنٹے میں یہ لیکچر تمام ہُوا جو حجم میں سَو صفحے کلاں تک ہوگا۔ غرضیکہ مولوی عبدالکریم صاحب نے یہ لیکچر شروع کیا اور کیسا شروع کیا کہ تمام سامعین لٹّو ہو گئے۔ فقرہ فقرہ پر صدائے آفرین وتحسین بُلند تھی اور بسا اوقات ایک ایک فقرہ کو دوبارہ پڑھنے کیلئے حاضرین

کی طرف سے فرمائش کی جاتی تھی۔ عمر بھر ہمارے کانوں نے ایسا خوش آئند لیکچر نہیں سُنا۔ دیگر مذاہب میں سے جتنے لوگوں نے لیکچر دِئے سچ تو یہ ہے کہ وُہ جلسہ کے مستفسرہ سوالوں کے جواب بھی نہیں تھے۔ عموماً سپیکر صرف چوتھے سوال پر ہی رہے اور باقی سوالوں کو اُنھوں نے بہت ہی کم پیش کیا۔ اور زیادہ تر اصحاب تو ایسے بھی تھے جو بولتے تو بہت تھے مگر اس میں جاندار بات کوئی نہیں تھی۔ بجز مرزا صاحب کے لیکچر کے جو اِن سوالوں کا علیحدہ علیحدہ مفصّل اور مکمل جواب تھا۔ اور جس کو حاضرینِ جلسہ نے نہایت ہی توجّہ اور دِلچسپی سے سُنا اور بڑا بیش قیمت اور عالی قدر خیال کِیا۔

ہم مرزا صاحب کے مُرید نہیں ہیں اور نہ اُن سے ہم کو کوئی تعلق ہے۔ لیکن انصاف کا خُون ہم کبھی نہیں کر سکتے اور نہ کوئی سلیم الفطرت اور صحیح کانشنس اس کو روا رکھ سکتا ہے۔ مرزا صاحب نے کل سوالوں کے جواب (جیسا کہ مناسب تھا) قرآن شریف سے دیئے اور تمام بڑے بڑے اصُول اور فروعاتِ اسلام کو دلائلِ عقلیہ اور براہینِ فلسفہ کے ساتھ مزیّن کیا۔ پہلے عقلی دلائل سے الٰہیات کے مسئلہ کو ثابت کرنا اور اس کے بعد کلامِ الٰہی کو بطورِ حوالہ پڑھنا ایک عجیب شان دِکھاتا تھا۔

مرزا صاحب نے نہ صرف مسائلِ قرآن کی فلاسفی بیان کی بلکہ الفاظِ قرآن کی فلالوجی اور فلاسفی بھی ساتھ ساتھ بیان کر دی۔ غرضیکہ مرزا صاحب کا لیکچر بحیثیت مجموعی ایک مکمّل اور حاوی لیکچر تھا جس میں بیشمار معارف و حقائق و حِکم و اسرار کے موتی چمک رہے تھے اور فلسفہ الٰہیہ کو ایسے ڈھنگ سے بیان کیا گیا تھا کہ تمام

اہل مذاہب ششدر ہو گئے تھے کسی شخص کے لیکچر کے وقت اتنے آدمی جمع نہیں تھے جتنے کہ مرزا صاحب کے لیکچر کے وقت۔ تمام ہال اُوپر نیچے سے بھر رہا تھا۔ اور سامعین ہمہ تن گوش ہو رہے تھے۔ مرزا صاحب کے لیکچر کے وقت اور دیگر سپیکروں کے لیکچروں کے امتیاز کے لئے اس قدر کہنا کافی ہے کہ مرزا صاحب کے لیکچر کے وقت خلقت اِس طرح آ آ کر گری جیسے شہد پر مکھیاں۔ مگر دُوسرے لیکچروں کے وقت بوجہ بے لُطفی بُہت سے لوگ بیٹھے بیٹھے اُٹھ جاتے تھے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کا لیکچر بالکل معمولی تھا۔ وُہی مُلّائی خیالات تھے۔ جن کو ہم لوگ ہر روز سُنتے ہیں۔ اس میں کوئی عجیب وغریب بات نہ تھی۔ اور مولوی صاحب موصوف کے دوسرے لیکچر کے وقت کئی شخص اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ مولوی صاحب ممدُوح کو اپنا لیکچر پُورا کرنے کے لئے چند منٹ زائد کی اجازت بھی نہیں دی گئی"۔

اخبار "چودھویں صدی"۔ راولپنڈی
بمطابق یکم فروری ۱۸۹۷ء

اخبار "جنرل و گوہرِ آصفی"۔ کلکتہ نے ۲۴ جنوری ۱۸۹۷ء کی اشاعت میں صفحہ ۲ پر "جلسۂ اعظم منعقدہ لاہور" اور "فتحِ اسلام" کے دوہرے عنوان سے لکھا:۔

"پیشتر اِس کے کہ ہم کارروائی جلسہ کی نسبت گفتگو کریں ہمیں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہمارے اخبار کے کالموں میں جیسا کہ اس کے ناظرین پر واضح ہوگا یہ بحث ہو چکی ہے کہ اس جلسۂ اعظمِ مذاہب میں اسلامی وکالت کے لئے سب سے زیادہ لائق کون شخص تھا۔ ہمارے ایک معزز نامہ نگار صاحب نے سب سے پہلے

خالی الذّہن ہو کر اور حق کو مدّ نظر رکھکر حضرت مرزا غلام احمد صاحب رئیس قادیان کو اپنی رائے میں منتخب فرمایا تھا۔ جن کے ساتھ ہمارے ایک اور مکرّم مخدوم نے اپنی مراسلت میں توارداً اتّفاق ظاہر کیا تھا۔ جناب مولوی محمد سعید فخر الدّین صاحب فخرؔ نے بڑے زور کے ساتھ اِس انتخاب کی نسبت جو اپنی آزاد مدلّل اور بیش قیمت رائے پبلک کے پیش فرمائی تھی اس میں حضرت مرزا غلام احمد صاحب رئیس قادیان۔ جناب سر سیّد احمد صاحب آف علی گڑھ کو انتخاب فرمایا تھا۔ اور ساتھ ہی اس اسلامی وکالت کا قرعہ حضراتِ ذیل کے نام نِکالا تھا:۔
جناب مولوی ابو سعید محمد حسین صاحب بٹالوی۔ جناب مولوی حاجی سیّد محمد علی صاحب کانپوری اور مولوی احمد حسین صاحب عظیم آبادی۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ ہمارے ایک لوکل اخبار کے ایک نامہ نگار نے جناب مولوی عبدالحق صاحب دہلوی مصنّف تفسیرِ حقّانی کو اِس کام کے لئے منتخب فرمایا تھا۔"

اِس کے بعد سوامی شوگن چندر کے اشتہار سے اس حصّہ کو نقل کر کے جس میں اُنھوں نے علمائے مذاہبِ مُختلفہ ہند کو بہت عار دِلا دِلا کر اپنے اپنے مذہب کے جوہر دِکھلانے کے لئے طلب کیا تھا۔ یہ اخبار لِکھتا ہے:۔

"اِس جلسے کے اشتہاروں وغیرہ کے دیکھنے اور دعوتوں کے پہنچنے پر کن کن علمائے ہند کی رگِ حمیّت نے مقدّس دینِ اسلام کی وکالت کے لئے جوش دِکھایا اور کہاں تک اُنھوں نے اسلامی حمایت کا بیڑا اُٹھا کر حجج و براہین کے ذریعے فرقانی ہیبت کا سِکّہ غیر مذاہب کے دِل پر بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہُوا ہے کہ کارکنانِ جلسہ نے خاص طور پر حضرت مرزا

غلام احمد صاحب اور سر سیّد احمد صاحب کو شریکِ جلسہ ہونے کے لئے خط لکھا۔ حضرت مرزا صاحب تو علالتِ طبع کی وجہ سے بنفسِ نفیس شریکِ جلسہ نہ ہو سکے۔ مگر اپنا مضمون بھیج کر اپنے ایک شاگردِ خاص جناب مولوی عبد الکریم صاحب سیالکوٹی کو اسکی قرائت کے لئے مقرر فرمایا۔ لیکن جناب سر سیّد نے شریکِ جلسہ ہونے اور مضمون بھیجنے سے کنارہ کشی فرمائی۔ یہ اس بنا پر نہ تھا کہ وُہ معمّر ہو چکے ہیں اور ایسے جلسوں میں شریک ہونے کے قابل نہیں رہے ہیں اور نہ اِس بناء پر تھا کہ اِنھیں ایّام میں ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد میرٹھ میں مقرر ہو چکا تھا۔ بلکہ یہ اس بناء پر تھا کہ مذہبی جلسے اُنکی توجّہ کے قابل نہیں۔ کیونکہ اُنھوں نے اپنی چٹھی میں جس کو ہم انشاء اللہ اپنے اخبار میں کسی اور وقت درج کرینگے صاف لکھ دیا ہے کہ وُہ کوئی واعظ یا ناصح یا مولوی نہیں یہ کام واعظوں اور ناصحوں کا ہے۔ جلسے کے پروگرام کے دیکھنے اور نیز تحقیق کرنے سے ہمیں یہ پتہ چلا ہے کہ جناب مولوی سیّد محمّد علی صاحب کانپوری۔ جناب مولوی عبد الحق صاحب دہلوی اور جناب مولوی احمد حسین صاحب عظیم آبادی نے اِن جلسہ کی طرف کوئی جوشیلی توجّہ نہیں فرمائی۔ اور نہ ہمارے مقدّس زمرۂ علماء سے کسی لائق فرد نے اپنا مضمون پڑھنے یا پڑھوانے کا عزم بتایا۔ ہاں دو ایک عالم صاحبوں نے بڑی ہمّت کر کے مَا نَحْنُ فِیْھَا میں قدم رکھا مگر اُلٹا۔ اِس لئے اُنھوں نے یا تو مقرّر کردہ مضامین پر کوئی گفتگو نہ کی یا بے سر و پا کچھ ہانک دیا جیسا کہ ہماری آئندہ رپورٹ سے واضح ہو گا۔ غرض جلسہ کی کارروائی سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف ایک حضرت مرزا غلام احمد صاحب رئیس قادیان تھے جنھوں نے اِس میدانِ مقابلہ میں اسلامی پہلوانی کا پُورا حق ادا فرمایا ہے اور اُس

انتخاب کو راست کیا ہے جو خاص آپکی ذات کو اسلامی وکیل مقرر کرنے میں پشاور۔ راولپنڈی۔ جہلم۔ شاہ پور۔ بھیرہ۔ خوشاب۔ سیالکوٹ۔ جموں۔ وزیرآباد لاہور۔ امرتسر۔ گورداسپور۔ لودھیانہ۔ شملہ۔ دہلی۔ انبالہ۔ ریاست پٹیالہ۔ کپورتھلہ۔ ڈیرہ دون۔ الہ آباد۔ مدراس۔ بمبئی۔ حیدر آباد دکن۔ بنگلور وغیرہ بلادِ ہند کے مختلف اسلامی فرقوں سے وکالت ناموں کے ذریعہ مزیّن بدستخط ہو کر وقوع میں آیا تھا۔ حق تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ

اگر اس جلسے میں حضرت مرزا صاحب کا مضمون نہ ہوتا تو اسلامیوں پر غیر مذاہب والوں کے رُوبرو ذِلّت وندامت کا قشقہ لگتا۔ مگر خُدا کے زبردست ہاتھ نے مقدّس اسلام کو گِرنے سے بچالیا۔ بلکہ اُس کو اِس مضمُون کی بدولت ایسی فتح نصیب فرمائی کہ موافقین تو موافقین مخالفین بھی سچّی فطرتی جوش سے کہہ اُٹھے کہ یہ مضمون سب پر بالا ہے۔ بالا ہے۔

بلکہ اختتام مضمون پر حق الامر معاندین کی زبان پر یُوں جاری ہو چکا تھا کہ اب اسلام کی حقیقت کھُلی اور اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔ جو انتخاب تیر بہدف کی طرح روزِ روشن میں ٹھیک نکلا۔ اب اسکی مخالفت میں دم زدن کی گنجائش ہے ہی نہیں بلکہ وُہ ہمارے فخر و ناز کا موجب ہے۔ اِس لئے اس میں اسلامی شوکت ہے اور اسی میں اِسلامی عظمت۔ اور حق بھی یہی ہے۔

اگرچہ جلسۂ اعظم مذاہب کا ہند میں یہ دوسرا اجلاس تھا۔ لیکن اِس نے اپنی شان و شوکت اور جاہ و عظمت کی رُو سے سارے ہندوستانی کانگرسوں اور کانفرنسوں کو مات کر دیا ہے۔ ہندوستان کے مختلف بلاد کے رؤسا اس میں شریک ہوئے۔ اور ہم بڑی خوشی سے یہ ظاہر کیا چاہتے ہیں کہ ہمارے مدراس نے بھی اس میں حصہ لیا ہے۔ جلسہ کی دلچسپی یہاں تک بڑھی کہ مشتہرہ تین دِن پر ایک دِن بڑھانا پڑا انعقادِ جلسہ کے لئے کارکن کمیٹی نے لاہور میں سب سے بڑی وسعت کا مکان اسلامیہ کالج تجویز کیا لیکن خلقِ خُدا کا ازدحام اس قدر تھا کہ مکان کی وسعت غیر مکتفی ثابت ہوئی۔ جلسہ کی عظمت کا یہ کافی ثبوت ہے کہ کل پنجاب کے عمائدین کے علاوہ چیفکورٹ اور ہائیکورٹ الہ آباد کے آنریبل ججز۔ بابو پرتول چندر صاحب اور مسٹر بینرجی نہایت خوشی سے شریکِ جلسہ ہوئے ؎“

یہ مضمون پہلے رپورٹ جلسۂ اعظم مذاہب لاہور میں من وعن شائع ہوا اور جماعت احمدیہ کی طرف سے ”اسلامی اصول کی فلاسفی“ کے عنوان کے ماتحت کتابی صورت میں اس کے کئی ایڈیشن اردو اور انگریزی زبان میں شائع ہو چکے ہیں جن کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا اس وقت مشکل ہے۔ علاوہ ازیں اس کا ترجمہ عربی۔ فارسی۔ گجراتی کنیاری۔ ہندی۔ گورمکھی۔ فرانسیسی۔ ڈچ۔ سپینش۔ جرمنی۔ انڈونیشی۔ برمی۔ چینی اور سہیلی وغیرہ زبانوں میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اور اس پر بڑے بڑے فلاسفروں اور غیر مُلکی اخبارات کے ایڈیٹروں نے بھی نہایت عُمدہ ریویو لکھے ہیں ؎

امریکہ اور یورپ میں جب ”اسلامی اصول کی فلاسفی“ کے ترجمہ کی اشاعت ہوئی تو مغربی مفکّرین نے اِس لیکچر کو بیحد سراہا۔ چند آرار بطورِ مثال درج ذیل ہیں:۔

برسٹل ٹائمز اینڈ مرر" نے لکھا:۔

"یقیناً وہ شخص جو اِس رنگ میں یورپ و امریکہ کو مخاطب کرتا ہے کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔"

سپر چوئل جنرل بوسٹن نے لکھا:۔

"یہ کتاب بنی نوعِ انسان کیلئے ایک خالص بشارت ہے۔"

پی او کدا دو بزیر کلپانی نے لکھا:۔

"یہ کتاب عرفانِ الٰہی کا چشمہ ہے۔"

تھیوسوفیکل بُک نوٹس نے لکھا:۔

"یہ کتاب محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذہب کی بہترین اور سب سے زیادہ دلکش تصویر ہے۔"

انڈین ریویو نے لکھا:۔

"اِس کتاب کے خیالات روشن، جامع اور حکمت سے پُر ہیں اور پڑھنے والے کے مُنہ سے بے اختیار اسکی تعریف نکلتی ہے۔"

مُسلم ریویو نے لکھا:۔

"اِس کتاب کا مطالعہ کرنے والا اس میں بہت سے سچّے اور عمیق اور اصلی اور رُوح افزا خیالات پائے گا۔"

(بحوالہ "سلسلہ احمدیہ" مؤلفہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب صفحہ ۱۷ و ۴۲)

یہ وُہ قیمتی مضمون ہے جسے اَلشّرکَۃُ الاِسلَامِیّۃ لمیٹڈ ربوہ نے پہلی بار ۱۹۵۴ء میں اور دُوسری بار دسمبر ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا۔ اور اب قارئین

کی ضیافتِ طبع کے لئے عکسی صورت میں پیش کر رہی ہے۔ اِس مضمون کی یہ خوبی ہے کہ اس میں کسی دُوسرے مذہب پر حملہ نہیں کیا گیا بلکہ محض اسلام کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور جوابات قرآن مجید ہی سے دِئے گئے ہیں ہمیں اُمّید ہے کہ اسلام سے محبّت رکھنے والے دوست حتّی المقدُور اس کی اشاعت میں حصّہ لیں گے۔ اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔

خاکسار

جلال الدّین شمس

ربوہ۔ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ قمری۔ تبلیغ ۱۳۴۱ھ ہجری شمسی۔

فروری ۱۹۶۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

اسلام

دعویٰ اور دلیل الہامی کتاب سے ہونا ضروری ہے

آج اس جلسۂ مبارک میں جس کی غرض یہ ہے کہ ہر ایک صاحب جو بلائے گئے ہیں سوالاتِ مشتہرہ کی پابندی سے اپنے اپنے مذہب کی خوبیاں بیان فرماویں میں اسلام کی خوبیاں بیان کروں گا۔ اور پہلے اس سے کہ میں اپنے مطلب کو شروع کروں اس قدر ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ جو کچھ بیان کروں خدائے تعالیٰ کے پاک کلام قرآن شریف سے بیان کروں۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ بہت ضروری ہے کہ ہر ایک شخص جو کسی کتاب کا پابند ہو اور اُس کتاب کو ربّانی کتاب سمجھتا ہو وہ ہر ایک بات میں اُسی کتاب کے حوالہ سے جواب دے اور اپنی وکالت کے اختیارات کو ایسا وسیع نہ کرے کہ گویا وہ ایک نئی کتاب بنا رہا ہے۔ سو چونکہ آج ہمیں قرآن شریف

کی خوبیوں کو ثابت کرنا ہے اور اس کے کمالات کو دِکھانا ہے اِس لئے مناسب ہے کہ ہم کسی بات میں اسکے اپنے بیان سے باہر نہ جائیں اور اسی کے اشارہ یا تصریح کے موافق یا اُسی کی آیات کے حوالہ سے ہر ایک مقصد کو تحریر کریں۔ تا ناظرین کو موازنہ اور مقابلہ کرنے کے لئے آسانی ہو اور چونکہ ہر ایک صاحب جو پابندِ کتاب ہیں اپنی اپنی الہامی کتاب کے بیان کے پابند رہیں گے اور اسی کتاب کے اقوال پیش کرینگے۔ اس لئے ہم نے اس جگہ احادیث کے بیان کو چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ تمام صحیح حدیثیں قرآنِ شریف سے ہی لی گئی ہیں۔ اور وہ کامل کتاب ہے جس پر تمام کتابوں کا خاتمہ ہے۔ غرض آج قرآن شریف کی شان ظاہر ہونے کا دِن ہے۔ اور ہم خُدا سے دُعا مانگتے ہیں کہ وُہ اس کام میں ہمارا مددگار ہو۔ آمین۔

سوالِ اوّل کا جواب

انسان کی جسمانی، اخلاقی اور رُوحانی حالتیں

معزّز ناظرین کو خیال رہے کہ اس مضمون کے ابتدائی صفحوں میں بعض تمہیدی عبارتیں ہیں جو بظاہر غیر متعلّق معلوم دیتی ہیں مگر اصل جوابات کے سمجھنے کے لئے پہلے ان کا سمجھنا نہایت ضروری ہے اِس لئے صفائیِ بیان کیلئے قبل از شروع مطلب اِن عبارتوں کو لکھا گیا تا اصل مطلب سمجھنے میں دِقّت نہ ہو ٭

اقسام حالاتِ ثلاثہء انسانی

اب واضح ہو کہ پہلا سوال انسان کی طبعی اور اخلاقی اور رُوحانی

حالتوں کے بارے میں ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ کے پاک کلام قرآن شریف نے ان تینوں حالتوں کی اس طرح پر تقسیم کی ہے کہ ان تینوں کے علیحدہ علیحدہ تین مبدار ٹھہرائے ہیں۔ یا یوں کہو کہ تین سرچشمے قرار دِئے ہیں جن میں سے تین جُدا جُدا یہ حالتیں نکلتی ہیں:۔

پہلی حالت نفسِ امّارہ

پہلا سرچشمہ جو تمام طبعی حالتوں کا مورد اور مصدر ہے اس کا نام قرآن شریف نے نفسِ امّارہ رکھا ہے۔ جیسا کہ وُہ فرماتا ہے:۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ (پ۱۳ ع)

یعنی نفسِ امّارہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کو بدی کی طرف جو اس کے کمال کے مخالف اور اس کی اخلاقی حالتوں کے برعکس ہے جُھکاتا ہے اور ناپسندیدہ اور بدراہوں پر چلانا چاہتا ہے۔ غرض بے اعتدالیوں اور بدیوں کی طرف جانا انسان کی ایک حالت ہے جو اخلاقی حالت سے پہلے اس پر طبعًا غالب ہوتی ہے۔ اور یہ حالت اس وقت تک طبعی حالت کہلاتی ہے جب تک کہ انسان عقل اور معرفت کے زیرِ سایہ نہیں چلتا۔ بلکہ چارپایوں کی طرح کھانے پینے، سونے جاگنے یا غصّہ اور جوش دِکھانے وغیرہ امور میں طبعی جذبات کا پیرو رہتا ہے۔ اور جب انسان عقل اور معرفت کے مشورہ سے طبعی حالتوں میں تصرف کرتا اور اعتدالِ مطلوب کی رعایت رکھتا ہے اُس وقت اِن تینوں حالتوں کا نام طبعی حالتیں نہیں رہتا۔ بلکہ اُس وقت یہ حالتیں اخلاقی حالتیں کہلاتی ہیں۔ جیسا کہ آگے بھی کچھ ذِکر اس کا آئیگا ⁂

دُوسری حالت نفسِ لوّامہ

اور اخلاقی حالتوں کے سرچشمہ کا نام قرآن شریف میں نفسِ لوّامہ ہے
جیسا کہ وُہ قرآن شریف میں فرماتا ہے:۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ۔ (پ۲۹ ع۱۷)

یعنی مَیں اس نفس کی قسم کھاتا ہُوں جو بدی کے کام اور ہر ایک بے اعتدالی پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے۔ یہ نفسِ لوّامہ انسانی حالتوں کا دوسرا سرچشمہ ہے جس سے اخلاقی حالتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس مرتبہ پر انسان دُوسرے حیوانات کی مشابہت سے نجات پاتا ہے۔ اور اس جگہ نفسِ لوّامہ کی قسم کھانا اس کو عزّت دینے کے لئے ہے۔ گویا وُہ نفسِ امّارہ سے نفسِ لوّامہ بن کر بوجہ اس ترقّی کے جنابِ الٰہی میں عزّت پانے کے لائق ہوگیا۔ اور اس کا نام لوّامہ اس لئے رکھّا کہ وُہ انسان کو بدی پر ملامت کرتا ہے۔ اور اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ انسان اپنے طبعی لوازم میں شُترِ بے مہار کی طرح چلے اور چارپایوں کی زندگی بسر کرے۔ بلکہ یہ چاہتا ہے کہ اس سے اچھی حالتیں اور اچھّے اخلاق صادر ہوں اور انسانی زندگی کے تمام لوازم میں کوئی بے اعتدالی ظہُور میں نہ آوے اور طبعی جذبات اور طبعی خواہشیں عقل کے مشورہ سے ظہور پذیر ہوں۔ پس چونکہ وُہ بُری حرکت پر ملامت کرتا ہے۔ اِس لئے اس کا نام نفسِ لوّامہ ہے یعنی بُہت ملامت کرنیوالا اور نفسِ لوّامہ اگرچہ طبعی جذبات پسند نہیں کرتا بلکہ اپنے تئیں ملامت کرتا رہتا ہے لیکن نیکیوں کے بجالانے پر پُورے طور سے قادر بھی نہیں ہوسکتا اور کبھی نہ کبھی

طبعی جذبات اس پر غلبہ کر جاتے ہیں۔ تب گر جاتا ہے اور ٹھوکر کھاتا ہے۔ گویا وہ ایک کمزور بچے کی طرح ہوتا ہے جو گرنا نہیں چاہتا ہے مگر کمزوری کی وجہ سے گرتا ہے۔ پھر اپنی کمزوری پر نادم ہوتا ہے۔ غرض یہ نفس کی وُہ اخلاقی حالت ہے جب نفس اخلاقِ فاضلہ کو اپنے اندر جمع کرتا ہے اور سرکشی سے بیزار ہوتا ہے۔ مگر پُورے طور پر غالب نہیں آسکتا ؛

تیسری حالت نفسِ مُطمئنّہ

پھر ایک تیسرا چشمہ ہے جس کو رُوحانی حالتوں کا مبدار کہنا چاہیئے۔ اس سرچشمہ کا نام قرآن شریف نے نفسِ مطمئنّہ رکھا ہے جیسا کہ وُہ فرماتا ہے:۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (پ۳۰ ع ۱۴) ؛

یعنی اَے نفس آرام یافتہ جو خُدا سے آرام پاگیا اپنے خُدا کی طرف واپس چلا آ۔ تُو اُس سے راضی اور وُہ تجھ سے راضی۔ پس میرے بندوں میں مل جا اور میرے بہشت کے اندر آجا۔ یہ وُہ مرتبہ ہے جس میں نفس تمام کمزوریوں سے نجات پاکر رُوحانی قوّتوں سے بھر جاتا ہے۔ اور خدائے تعالیٰ سے ایسا پیوند کرلیتا ہے کہ بغیر اسکے جی بھی نہیں سکتا۔ اور جس طرح پانی اوپر سے نیچے کی طرف بہتا ہے اور بسبب اپنی کثرت اور نیز روکوں کے دُور ہونے سے بڑے زور سے چلتا ہے اِسی طرح وہ خُدا کی طرف بہتا چلا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے وُہ نفس جو خُدا سے آرام پاگیا اس کی طرف

واپس چلا آ۔ پس وہ اسی زندگی میں نہ موت کے بعد ایک عظیم الشان تبدیلی پیدا کرتا ہے اور اسی دُنیا میں نہ دوسری جگہ ایک بہشت اس کو ملتا ہے اور جیسا کہ اس آیت میں لکھا ہے کہ اپنے ربّ کی طرف یعنی پرورش کرنے والے کی طرف واپس آ۔ ایسا ہی اس وقت یہ خدا سے پرورش پاتا ہے۔ اور خدا کی محبت اس کی غذا ہوتی ہے اور اسی زندگی بخش چشمہ سے پانی پیتا ہے۔ اِس لئے موت سے نجات پاتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے :-

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (پ ۳۰ ع ۱۶)

یعنی جس نے ارضی جذبات سے اپنے نفس کو پاک کیا وُہ بچ گیا اور نہیں ہلاک ہوگا۔ مگر جس نے ارضی جذبات میں جو طبعی جذبات ہیں اپنے تئیں چھپا دِیا وُہ زِندگی سے نا اُمید ہو گیا ؎

غرض یہ تین حالتیں ہیں جن کو دُوسرے لفظوں میں طبعی اور اخلاقی اور رُوحانی حالتیں کہہ سکتے ہیں۔ اور چونکہ طبعی تقاضے افراط کے وقت بہت خطرناک ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات اخلاق اور رُوحانیت کا ستّیا ناس کر دیتے ہیں۔ اس لئے خدائے تعالیٰ کی پاک کتاب میں ان کو نفسِ امّارہ کی حالتوں سے موسوم کیا گیا ہے۔ اگر یہ سوال ہو کہ انسان کی طبعی حالتوں پر قرآنِ شریف کا کیا اثر ہے اور وہ اُن کی نسبت کیا ہدایت دیتا ہے اور عملی طور پر کس حد تک انکو رکھنا چاہتا ہے تو واضح ہو کہ قرآن شریف کے رُو سے انسان کی طبعی حالتوں کو اس کی اخلاقی اور رُوحانی حالتوں سے نہایت ہی شدید تعلقات واقع ہیں۔

یہاں تک کہ انسان کے کھانے پینے کے طریقے بھی انسان کی اخلاقی اور رُوحانی حالتوں پر اثر کرتے ہیں۔ اور اگر ان طبعی حالتوں سے شریعت کی ہدایتوں کے موافق کام لیا جائے تو جیسا کہ نمک کی کان میں پڑ کر ہر ایک چیز نمک ہی ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی یہ تمام حالتیں اخلاقی ہی ہو جاتی ہیں اور رُوحانیت پر نہایت گہرا اثر کرتی ہیں۔ اِسی واسطے قرآن شریف نے تمام عبادات اور اندرُونی پاکیزگی کی اغراض اور خشوع خضوع کے مقاصد میں جسمانی طہارتوں اور جسمانی آداب اور جسمانی تعدیل کو بہت ملحوظ رکھا ہے۔ اور غور کرنے کے وقت یہی فلاسفی نہایت صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جسمانی اوضاع کا رُوح پر بہت قوی اثر ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے طبعی افعال گو بظاہر جسمانی ہیں مگر ہماری رُوحانی حالتوں پر ضرور اُن کا اثر ہے۔ مثلاً جب ہماری آنکھیں رونا شروع کریں اور گو تکلّف سے ہی رو دیں۔ مگر فی الفور ان آنسوؤں کا ایک شعلہ اُٹھ کر دِل پر جا پڑتا ہے۔ تب دِل بھی آنکھوں کی پیروی کر کے غمگین ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی جب ہم تکلّف سے ہنسنا شروع کریں تو دِل میں بھی ایک انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جسمانی سجدہ بھی رُوح میں خشوع اور عاجزی کی حالت پیدا کرتا ہے۔ اس کے مقابل پر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب ہم گردن کو اُونچی کھینچ کر اور چھاتی کو ابھار کر چلیں تو یہ وضع رفتار ہم میں ایک قسم کا تکبّر اور خود بینی پیدا کرتی ہے تو ان نمونوں سے پُورے انکشاف کے ساتھ کُھل جاتا ہے کہ بیشک جسمانی اوضاع کا رُوحانی حالتوں پر اثر ہے ؎

ایسا ہی تجربہ ہم پر ظاہر کرتا ہے کہ طرح طرح کی غذاؤں کا بھی دماغی اور دِلی

قوتوں پر ضرور اثر ہے۔ مثلاً ذرا غور سے دیکھنا چاہیئے کہ جو لوگ کبھی گوشت نہیں کھاتے رفتہ رفتہ اُن کی شجاعت کی قوت کم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ نہایت دِل کے کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور ایک خداداد اور قابلِ تعریف قوّت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ ان کی شہادت خدا کے قانونِ قُدرت سے اِس طرح پر بھی ملتی ہے کہ چارپایوں میں سے جس قدر گھاس خور جانور ہیں کوئی بھی اُن میں سے وُہ شجاعت نہیں رکھتا جو ایک گوشت خور جانور رکھتا ہے۔ پرندوں میں بھی یہی بات مشاہدہ ہوتی ہے پس اس میں کیا شک ہے کہ اخلاق پر غذاؤں کا اثر ہے ہاں جو لوگ دِن رات گوشت خوری پر زور دیتے ہیں اور نباتاتی غذاؤں سے بہُت ہی کم حِصّہ رکھتے ہیں وُہ بھی حلم اور انکسار کے خلق میں کم ہو جاتے ہیں۔ اور میانہ روش کو اختیار کرنے والے دونوں خُلق کے وارث ہوتے ہیں۔ اِسی حکمت کے لحاظ سے خُدائے تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے :-

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (۷ : ۳۲)

یعنی گوشت بھی کھاؤ اور دُوسری چیزیں بھی کھاؤ مگر کسی چیز کی حد سے زیادہ کثرت نہ کرو۔ تا اُس کا اخلاقی حالت پر بد اثر نہ پڑے۔ اور تا یہ کثرت مضرِ صحت بھی نہ ہو۔ اور جیسا کہ جسمانی افعال اور اعمال کا رُوح پر اثر پڑتا ہے ایسا ہی کبھی رُوح کا اثر بھی جسم پر جا پڑتا ہے۔ جس شخص کو کوئی غم پہنچے آخر وُہ چشم پُر آب ہو جاتا ہے اور جس کو خوشی ہو آخر وُہ تبسّم کرتا ہے۔ جس قدر ہمارا کھانا پینا، سونا جاگنا، حرکت کرنا، آرام کرنا، غسل کرنا وغیرہ افعالِ طبعیّہ ہیں یہ تمام افعال ضرُوری ہمارے رُوحانی حالات پر اثر کرتے ہیں۔ ہماری جسمانی بناوٹ کا ہماری انسانیت

سے بڑا تعلق ہے۔ دماغ کے ایک مقام پر چوٹ لگنے سے یک لخت حافظہ جاتا رہتا ہے۔ اور دُوسرے مقام پر چوٹ لگنے سے ہوش و حواس رُخصت ہوتے ہیں۔ وبا کی ایک زہریلی ہوا کس قدر جلدی سے جسم میں اثر کر کے پھر دِل میں اثر کرتی ہے اور دیکھتے دیکھتے وُہ اندرُونی سِلسلہ جس کے ساتھ تمام نظام اخلاق کا ہے درہم برہم ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان دیوانہ سا ہو کر چند منٹ میں گذر جاتا ہے۔ غرض جسمانی صدمات بھی عجیب نظّارہ دِکھاتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رُوح اور جسم کا ایک اَیسا تعلّق ہے کہ اس راز کو کھولنا انسان کا کام نہیں۔ اس سے زیادہ اس تعلّق کے ثبُوت پر یہ دلیل ہے کہ غور سے معلوم ہوتا ہے کہ رُوح کی ماں جسم ہی ہے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ میں رُوح کبھی اُوپر سے نہیں گِرتی بلکہ وُہ ایک نور ہے جو نُطفہ میں ہی پوشیدہ طور پر مخفی ہوتا ہے اور جسم کی نشوونما کے ساتھ چمکتا جاتا ہے۔ خُدائے تعالیٰ کا پاک کلام ہمیں سمجھاتا ہے کہ رُوح اس قالب میں سے ہی ظہوُر پذیر ہو جاتی ہے جو نطفہ سے رحم میں تیار ہوتا ہے جیسا کہ وُہ قرآن شریف میں فرماتا ہے :۔

ثُمَّ اَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (پ۱۸ ع ۱)

یعنی پھر ہم اِس جسم کو جو رحم میں تیار ہوُا تھا ایک اَور پیدائش کے رنگ میں لاتے ہیں۔ اور ایک اَوْر خلقت اس کی ظاہر کرتے ہیں جو رُوح کے نام سے موسوم ہے۔ اور خدا بہت برکتوں والا ہے۔ اور ایسا خالق ہے جو کوئی اس کے برابر نہیں ۞

اور یہ جو فرمایا کہ ہم اسی جسم میں سے ایک اور پیدائش ظاہر کرتے ہیں۔

یہ ایک گہرا راز ہے جو رُوح کی حقیقت دِکھلا رہا ہے۔ اور ان نہایت مُستحکم تعلّقات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو رُوح اور جسم کے درمیان واقع ہیں اور یہ اشارہ ہمیں اس بات کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ انسان کے جسمانی اعمال اور اقوال اور تمام طبعی افعال جب خُدائے تعالےٰ کے لئے اور اُس کی راہ میں ظاہر ہونے شرُوع ہوں تو ان سے بھی یہی الٰہی فلاسفی متعلّق ہے۔ یعنی ان مخلصانہ اعمال میں بھی ابتدا ہی سے ایک رُوح مخفی ہوتی ہے جیسا کہ نُطفہ میں مخفی تھی۔ اور جیسے جیسے ان اعمال کا قالب تیّار ہوتا جائے وہ رُوح چمکتی جاتی ہے۔ اور جب وُہ قالب پورا تیار ہو چکتا ہے تو یک دفعہ وہ رُوح اپنی کامل تجلّی کے ساتھ چمک اٹھتی ہے۔ اور اپنی رُوحی حیثیت سے اپنے وجُود کو دِکھا دیتی ہے۔ اور زندگی کی صریح حرکت شرُوع ہو جاتی ہے جبھی کہ اعمال کا پُورا قالب تیار ہو جاتا ہے۔ مثلاً بجلی کی طرح ایک چیز اندر سے اپنی کھلی چمک دِکھلانا شرُوع کر دیتی ہے۔ یہ وُہی زمانہ ہوتا ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں مثالی طور سے فرماتا ہے۔

فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ[1]

یعنی جب مَیں نے اس کا قالب بنا لیا اور تجلّیات کے تمام مظاہر درست کر لئے اور اپنی رُوح اُس میں پھُونک دی تو تم سب لوگ اُس کے لئے زمین پر سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ۔ سو اس آیت میں یہی اشارہ ہے کہ جب اعمال کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے تو اس قالب میں وہ رُوح چمک اُٹھتی ہے جس کو

---

[1] ۱۵ : ۳۱

خُدائے تعالیٰ اپنی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے۔ کیونکہ دُنیوی زندگی کے فنار کے بعد وُہ قالب تیّار ہوتا ہے۔ اس لئے الٰہی روشنی جو پہلے دھیمی تھی یک دفعہ بھڑک اُٹھتی ہے اور واجب ہوتا ہے کہ خُدا کی ایسی شان کو دیکھ کر ہر ایک سجدہ کرے اور اس کی طرف کھینچا جائے۔ سو ہر ایک اس نور کو دیکھکر سجدہ کرتا ہے اور طبعًا اس طرف آتا ہے۔ بجز ابلیس کے جو تاریکی سے دوستی رکھتا ہے ؞

رُوح کا مخلُوق ہونا

پھر مَیں پہلی بات کی طرف رجُوع کر کے بیان کرتا ہُوں کہ یہ بات نہایت درست اور صحیح ہے کہ رُوح ایک لطیف نُور ہے جو اس جسم کے اندر ہی سے پَیدا ہو جاتا ہے جو رحم میں پرورش پاتا ہے۔ پیدا ہونے سے مُراد یہ ہے کہ اوّل مخفی اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ پھر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور ابتدائً اس کا خمیر نُطفہ میں موجود ہوتا ہے۔ بیشک وُہ آسمانی خُدا کے ارادہ سے اور اس کے اِذن اور اس کی مشیئت سے ایک مجہول الکُنہ علاقہ کے ساتھ نُطفہ سے تعلّق رکھتا ہے۔ اور نطفہ کا وُہ ایک روشن اور نورانی جوہر ہے۔ نہیں کہہ سکتے کہ وُہ نُطفہ کی ایسی جُزو ہے جیسا کہ جسم جسم کی جُزو ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وُہ باہر سے آتا ہے یا زمین پر گر کر نطفہ کے مادے سے آمیزش پاتا ہے۔ بلکہ وُہ ایسا نُطفہ میں مخفی ہوتا ہے جیسا کہ آگ پتھّر کے اندر ہوتی ہے۔ خُدا کی کتاب کا یہ منشاء نہیں ہے کہ رُوح الگ طور پر آسمان سے نازل ہوتی ہے یا فضاء سے زمین پر

گرتی ہے اور پھر کسی اتّفاق سے نُطفہ کے ساتھ مل کر رحم کے اندر چلی جاتی ہے
بلکہ یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ٹھہر سکتا۔ اگر ہم ایسا خیال کریں تو قانُونِ قدرت ہمیں
باطل پر ٹھہراتا ہے۔ ہم روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ گندے اور باسی کھانوں میں اور
گندے زخموں میں ہزارہا کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ مَیلے کپڑوں میں صدہا جُوئیں پڑ
جاتی ہیں۔ انسان کے پیٹ کے اندر بھی کدّو دانے وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔
اب کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وُہ باہر سے آتے ہیں یا آسمان سے اُترتے کسی کو
دِکھائی دیتے ہیں۔ سو صحیح بات یہ ہے کہ رُوح جسم میں سے ہی نکلتی ہے اور
اِسی دلیل سے اس کا مخلوق ہونا بھی ثابت ہوتا ہے ؀

رُوح کی دُوسری پیدائش

اب اس وقت ہمارا مطلب اس بیان سے یہ ہے کہ جس قادرِ مطلق نے
رُوح کو قدرتِ کاملہ کے ساتھ جسم میں سے ہی نکالا ہے اس کا یہی ارادہ
معلوم ہوتا ہے کہ رُوح کی دُوسری پیدائش کو بھی جسم کے ذریعہ سے ہی ظہُور
میں لاوے۔ رُوح کی حرکتیں ہمارے جسم کی حرکتوں پر موقوف ہیں جس طرف ہم
جسم کو کھینچتے ہیں رُوح بھی بالضرور پیچھے پیچھے کھینچی چلی آتی ہے۔ اِس لئے انسان
کی طبعی حالتوں کی طرف متوجّہ ہونا خُدائے تعالےٰ کی سچّی کتاب کا کام ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ قرآن شریف نے انسان کی طبعی حالتوں کی اصلاح کے لئے بُہت توجہ
فرمائی ہے۔ اور انسان کا ہنسنا۔ رونا۔ کھانا۔ پینا۔ پہننا۔ سونا۔ بولنا۔ چُپ ہونا
بیوی کرنا۔ مجرّد رہنا۔ چلنا۔ ٹھہرنا اور ظاہری پاکیزگی غُسل وغیرہ کی شرائط

بجا لانا اور بیماری کی حالت اور صحت کی حالت میں خاص خاص امور کا پابند ہونا
ان سب باتوں پر ہدایتیں لکھی ہیں۔ اور انسان کی جسمانی حالتوں کو رُوحانی حالتوں
پر بہت ہی مؤثر قرار دیا ہے۔ اگر ان ہدایتوں کو تفصیل سے لکھا جائے تو میں
خیال نہیں کرسکتا کہ اس مضمون کے سنانے کے لئے کوئی وقت کافی مل سکے؎

انسان کی تدریجی ترقّی

میں جب خدا کے پاک کلام پر غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کیونکر اس
نے اپنی تعلیموں میں انسان کو اس کی طبعی حالتوں کی اصلاح کے قواعد عطا فرما کر
پھر آہستہ آہستہ اُوپر کی طرف کھینچا ہے اور اعلیٰ درجہ کی رُوحانی حالت تک پہنچانا
چاہا ہے تو مجھے یہ پُر معرفت قاعدہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوّل خدا نے یہ چاہا
ہے کہ انسان کو نشست برخاست اور کھانے پینے اور بات چیت اور تمام اقسام
معاشرت کے طریق سکھلا کر اُس کو وحشیانہ طریقوں سے نجات دیوے اور حیوانات
کی مشابہت سے تمیز کلّی بخش کر ایک ادنیٰ درجہ کی اخلاقی حالت جس کو ادب
اور شائستگی کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں سکھلاوے۔ پھر انسان کی نیچرل عادات
کو جن کو دُوسرے لفظوں میں اخلاقِ رذیلہ کہہ سکتے ہیں اعتدال پر لاوے تا وہ
اعتدال پا کر اخلاقِ فاضلہ کے رنگ میں آجائیں۔ مگر یہ دونوں طریقے دراصل ایک
ہی ہیں۔ کیونکہ طبعی حالتوں کی اصلاح کے متعلّق ہیں صرف ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کے
فرق نے ان کو دو قسم بنا دیا ہے۔ اور اس حکیم مطلق نے اخلاق کے نظام کو ایسے
طور سے پیش کیا ہے کہ جس سے انسان ادنیٰ خلق سے اعلیٰ خلق تک ترقّی کرسکے۔

اور پھر تیسرا مرحلہ ترقیات کا یہ رکھا ہے کہ انسان اپنے خالقِ حقیقی کی محبّت اور رضا میں محو ہو جائے۔ اور سب وجود اس کا خدا کے لئے ہو جائے۔ یہ وُہ مرتبہ ہے جس کو یاد دِلانے کیلئے مُسلمانوں کے دِین کا نام اسلام رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اسلام اِس بات کو کہتے ہیں۔ کہ بکلّی خُدا کے لئے ہو جانا اور اپنا کچھ باقی نہ رکھنا۔ جیسا کہ اللہ جلّ جلالہٗ فرماتا ہے:۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (پ۱ ع ۱۳)
قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (پ۸ ع ۷)
وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (پ۸ ع ۶) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (پ۳ ع ۱۲)

(ترجمہ) یعنی نجات یافتہ وُہ شخص ہے جو اپنے وجود کو خدا کے لئے اور خُدا کی راہ میں قربانی کی طرح رکھ دے۔ اور نہ صرف نیّت سے بلکہ نیک کاموں سے اپنے صدق کو دِکھلا دے۔ جو شخص ایسا کرے اس کا بدلہ خُدا کے نزدیک مقرّر ہو چُکا۔ اور اَیسے لوگوں پر نہ کچُھ خوف ہے اور نہ وُہ غمگین ہونگے۔ کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا زِندہ رہنا اور میرا مرنا اس خُدا کے لئے ہے جس کی ربوبیّت تمام چیزوں پر محیط ہے۔ کوئی چیز اور کوئی شخص اس کا شریک نہیں اور مخلوق کو

کسی قسم کی شراکت اس کے ساتھ نہیں۔ مجھے یہی حکم ہے کہ مَیں ایسا کروں اور اسلام کے مفہوم پر قائم ہونے والا یعنی خُدا کی راہ میں اپنے وجود کی قربانی دینے والا سب سے اوّل مَیں ہُوں۔ یہ میری راہ ہے۔ سو آؤ میری راہ اختیار کرو۔ اور اس کے مخالف کوئی راہ اختیار نہ کرو کہ خُدا سے دُور جا پڑو گے۔ اُن کو کہہ دے کہ اگر خُدا سے پیار کرتے ہو تو آؤ میرے پیچھے ہو لو اور میری راہ پر چلو۔ تا خُدا بھی تم سے پیار کرے اور تمھارے گُناہ بخشے۔ اور وُہ تو بخشندہ اور رحیم ہے ؁

طبعی حالتوں اور اخلاق میں ما بہ الامتیاز اور جیوہتیا کا رد

اب ہم انسان کے ان تین مرحلوں کا جُدا جُدا بیان کریں گے۔ لیکن اوّل یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ طبعی حالتیں جن کا سرچشمہ اور مبدا نفسِ امّارہ ہے۔ خُدائے تعالیٰ کے پاک کلام کے اشارات کے موافق اخلاقی حالتوں سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ کیونکہ خُدا کے پاک کلام نے تمام نیچرل قویٰ اور جسمانی خواہشوں اور تقاضوں کو طبعی حالات کی مد میں رکھا ہے۔ اور وُہی طبعی حالتیں ہیں جو بالارادہ ترتیب اور تعدیل اور موقع بینی اور محل پر استعمال کرنے کے بعد اخلاق کا رنگ پکڑ لیتی ہیں۔ ایسا ہی اخلاقی حالتیں رُوحانی حالتوں سے کوئی الگ باتیں نہیں ہیں بلکہ وُہی اخلاقی حالتیں ہیں جو پُورے فنا فی اللہ اور تزکیۂ نفس اور پورے انقطاع اِلی اللہ اور پُوری محبّت اور پوری محویّت اور پُوری سکینت اور اطمینان اور پوری موافقت باللہ سے رُوحانیت کا رنگ

پکڑ لیتی ہیں طبعی حالتیں جب تک اخلاقی رنگ میں نہ آئیں کسی طرح انسان کو قابلِ تعریف نہیں بناتیں - کیونکہ وُہ دُوسرے حیوانات بلکہ جمادات میں بھی پائی جاتی ہیں - ایسا ہی مجرّد اخلاق کا حاصل کرنا بھی انسان کو رُوحانی زندگی نہیں بخشتا بلکہ ایک شخص خدائے تعالیٰ کے وجود سے ہی منکر رہ کر اچھے اخلاق دکھلا سکتا ہے دِل کا غریب ہونا یا دل کا حلیم ہونا یا صُلح کار ہونا یا ترکِ شر کرنا اور شریر کے مقابلہ پر نہ آنا یہ تمام طبعی حالتیں ہیں اور ایسی باتیں ہیں جو ایک نا اہل کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں جو اصل سرچشمۂ نجات سے بے نصیب اور نا آشنا محض ہے اور بہت سے چارپائے غریب بھی ہوتے ہیں اور ہلنے اور خُوپذیر ہونے سے صُلح کاری بھی دِکھلاتے ہیں - سونے پر سونٹا مارنے سے کوئی مقابلہ نہیں کرتے مگر پھر بھی ان کو انسان نہیں کہہ سکتے - چہ جائیکہ ان خصلتوں سے وُہ اعلیٰ درجہ کے انسان بن سکیں - ایسا ہی بد سے بد عقیدے والا بلکہ بعض بدکاریوں کا مرتکب ان باتوں کا پابند ہو سکتا ہے - ممکن ہے کہ انسان رحم میں اِس حد تک پہنچ جائے کہ اگر اُس کے اپنے ہی زخم میں کیڑے پڑیں اُن کو بھی قتل کرنا روا نہ رکھے اور جانداروں کی پاسداری اِس قدر کرے کہ جُوئیں جو سر میں پڑتی ہیں یا وُہ کیڑے جو پیٹ اور انتڑیوں اور دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اُن کو بھی آزار دینا نہ چاہے بلکہ مَیں قبول کر سکتا ہوں کہ کسی کا رحم اِس حد تک پہنچے کہ وُہ شہد کھانا ترک کر دے - کیونکہ وُہ بہت سی جانوں کے تلف ہونے اور غریب مکھیوں کو ان کے استھان سے پراگندہ کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے - اور مَیں مانتا ہوں کہ کوئی مُشک سے بھی پرہیز کرے کیونکہ وُہ غریب ہرن کا خُون ہے اور اس

غریب کو قتل کرنے اور بچوں سے جُدا کرنے کے بعد میسّر آسکتا ہے۔ ایسا ہی
مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ کوئی موتیوں کے استعمال کو بھی چھوڑ دے۔
اور ابریشم کو پہننا بھی ترک کر دے کیونکہ یہ دونوں غریب کیڑوں کے ہلاک
کرنے سے ملتے ہیں۔ بلکہ مَیں یہاں تک مانتا ہُوں کہ کوئی شخص دُکھ کے
وقت جونکوں کے لگانے سے بھی پرہیز کرے اور آپ دُکھ اُٹھالے۔ اور
غریب جونک کی موت کا خواہاں نہ ہو۔ بالآخر اگر کوئی مانے یا نہ مانے مگر مَیں
مانتا ہُوں کہ کوئی شخص اِس قدر رحم کو کمال کے نقطہ تک پہنچا دے کہ پانی
پینا چھوڑ دے۔ اور اس طرح پانی کے کیڑوں کے بچانے کے لئے اپنے تئیں
ہلاک کرے۔ مَیں یہ سب کچھ قبول کرتا ہُوں لیکن مَیں ہرگز قبول نہیں کرسکتا کہ یہ تمام
طبعی حالتیں اخلاق کہلا سکتی ہیں یا صرف اِنھیں سے وُہ اندرُونی گند دھوئے جا
سکتے ہیں جن کا وجود خدائے تعالیٰ کے ملنے میں روک ہے۔ مَیں کبھی باور نہیں
کرُوں گا کہ اِس طرح کا غریب اور بے آزار بننا جس میں بعض چارپایوں اور
پرندوں کا کچھ نمبر بڑھا ہؤا ہے اعلیٰ انسانیت کے حصُول کا موجب ہوسکتا ہے۔
بلکہ میرے نزدیک یہ قانونِ قدرت سے لڑائی ہے۔ اور رضا کے بھاری خلق کے
برخلاف اور اس نعمت کو ردّ کرنا ہے۔ جو قدرت نے ہم کو عطا کی ہے۔ بلکہ وُہ
رُوحانیت ہر ایک خُلق کو محل اور موقع پر استعمال کرنے کے بعد اور پھر خُدا کی
راہوں میں وفاداری کے ساتھ قدم مارنے سے اور اسی کا ہو جانے سے ملتی
ہے۔ جو اس کا ہو جاتا ہے اس کی یہی نشانی ہے کہ وہ اس کے بغیر جی ہی
نہیں سکتا۔ عارف ایک مچھلی ہے جو خُدا کے ہاتھ سے ذبح کی گئی اور اُس کا پانی

خدا کی محبّت ہے ۔

اِصلاح کے تین طریق اور اصلاح کی اشد ضرورت پر آنحضرتؐ کا مبعوث ہونا

اَب میں پہلے کلام کی طرف رجوع کرتا ہُوں۔ مَیں ابھی ذکر کر چکا ہُوں کہ انسانی حالتوں کے سرچشمے تین ہیں یعنی نفسِ امّارہ۔ نفسِ لوّامہ۔ نفسِ مطمئنّہ۔ اور طریق اصلاح کے بھی تین ہیں۔ **اوّل** یہ کہ بے تمیز وحشیوں کو اس ادنیٰ خلق پر قائم کیا جائے کہ وُہ کھانے پینے اور شادی وغیرہ تمدّنی امُور میں انسانیت کے طریقے پر چلیں۔ نہ ننگے پھریں اور نہ کُتّوں کی طرح مُردار خوار ہوں اور نہ کوئی اور بے تمیزی ظاہر کریں۔ یہ طبعی حالتوں کی اصلاحوں میں سے اوّل درجہ کی اصلاح ہے۔ یہ اس قِسم کی اصلاح ہے کہ اگر مثلاً پورٹ بلیر کے جنگلی آدمیوں میں سے کسی آدمی کو انسانیت کے لوازم سکھلانا ہو تو پہلے ادنیٰ ادنیٰ اخلاق انسانیت اور طریقِ ادب کی اُن کو تعلیم دی جائے ۔

دُوسرا طریق اصلاح کا یہ ہے کہ جب کوئی ظاہری آداب انسانیت کے حاصل کر لیوے تو اُس کو بڑے بڑے اخلاق انسانیت کے سکھلائے جائیں اور اور انسانی قویٰ میں جو کُچھ بھرا پڑا ہے ان سب کو محل اور موقع پر استعمال کرنے کی تعلیم دی جائے ۔

تیسرا طریق اصلاح کا یہ ہے کہ جو لوگ اخلاقِ فاضلہ سے متّصف ہو گئے ہیں اَیسے خُشک زاہدوں کو شربتِ محبّت اور وصل کا مزہ چکھایا جائے۔

یہ تین اصلاحیں ہیں جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں۔

اور ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ایسے وقت میں مبعوث ہوئے تھے جب کہ دُنیا ہر ایک پہلو سے خراب اور تباہ ہو چُکی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (پ ۲۱ ع ۲)

یعنی جنگل بھی بگڑ گئے اور دریا بھی بگڑ گئے۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جو اہلِ کتاب کہلاتے ہیں وُہ بھی بگڑ گئے اور جو دُوسرے لوگ ہیں جن کو الہام کا پانی نہیں مِلا وُہ بھی بگڑ گئے۔ پس قرآن شریف کا کام دراصل مُردوں کو زندہ کرنا تھا۔ جیسا کہ وُہ فرماتا ہے :-

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (پ ۲۷ ع ۲)

یعنی یہ بات جان لو کہ اب اللہ تعالیٰ نئے سرے زمین کو بعد اس کے مرنے کے زندہ کرنے لگا ہے۔ اُس زمانہ میں عرب کا حال نہایت درجہ کی وحشیانہ حالت تک پُہنچا ہؤا تھا۔ اور کوئی نظام انسانیت کا اُن میں باقی نہیں رہا تھا۔ اور تمام معاصی اُن کی نظر میں فخر کی جگہ تھے۔ ایک ایک شخص صدہا بیویاں کر لیتا تھا حرام کا کھانا اُن کے نزدیک ایک شکار تھا۔ ماؤں کے ساتھ نکاح کرنا حلال سمجھتے تھے۔ اِسی واسطے اللہ تعالیٰ کو کہنا پڑا کہ

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (۴ : ۱۵)

یعنی آج مائیں تُمھاری تم پر حرام ہو گئیں۔ ایسا ہی وُہ مُردار کھاتے تھے آدم خور بھی تھے۔ دُنیا کا کوئی بھی گُناہ نہیں جو نہیں کرتے تھے۔ اکثر معاد کے مُنکر تھے۔

بہت سے اُن میں سے خدا کے وجود کے بھی قائل نہ تھے۔ لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتے تھے۔ یتیموں کو ہلاک کر کے ان کا مال کھاتے تھے۔ بظاہر تو انسان تھے مگر عقلیں مسلوب تھیں۔ نہ حیا تھی نہ شرم تھی نہ غیرت تھی۔ شراب کو پانی کی طرح پیتے تھے۔ جس کا زناکاری میں اوّل نمبر ہوتا تھا وُہی قوم کا رئیس کہلاتا تھا۔ بے علمی اس قدر تھی کہ ارد گرد کی تمام قوموں نے اُن کا نام اُمّی رکھ دیا تھا۔ ایسے وقت میں اور ایسی قوموں کی اصلاح کے لئے ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم شہر مکّہ میں ظہور فرما ہوئے۔ پس وُہ تین قسم کی اصلاحیں جن کا ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں اُن کا درحقیقت یہی زمانہ تھا۔ پس اسی وجہ سے قرآن شریف دنیا کی تمام ہدایتوں کی نسبت اکمل اور اتم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیونکہ دُنیا کی اَور کتابوں کو ان تین قسم کی اصلاحوں کا موقعہ نہیں ملا۔ اور قرآن شریف کو ملا۔ اور قرآن شریف کا یہ مقصد تھا کہ حیوانوں سے انسان بناوے اور انسان سے با اخلاق انسان بناوے اور با اخلاق انسان سے باخدا انسان بناوے اسی واسطے ان تین امور پر قرآن شریف مشتمل ہے ٭

قرآنی تعلیم کا اصل منشاء اصلاحاتِ ثلاثہ ہیں اور طبعی حالتیں تعدیل سے اخلاق بن جاتی ہیں

اور قبل اس کے جو ہم اصلاحاتِ ثلاثہ کا مفصل بیان کریں یہ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف میں کوئی ایسی تعلیم نہیں جو زبردستی ماننی پڑے۔ بلکہ تمام قرآن کا مقصد صرف اصلاحاتِ ثلاثہ ہیں۔ اور اس کی تمام تعلیموں کا

لُبّ لباب یہی تین اِصلاحیں ہیں اور باقی تمام احکام ان اصلاحوں کے لئے بطور وسائل کے ہیں ۔ اور جس طرح بعض وقت ڈاکٹر کو بھی صحّت کے پیدا کرنے کیلئے کبھی بچیر نے کبھی مرہم لگانے کی ضرورت پڑتی ہے ۔ ایسا ہی قرآنی تعلیم نے بھی انسانی ہمدردی کے لئے ان لوازم کو اپنے اپنے محل پر استعمال کیا ہے ۔ اور اس کے تمام معارف یعنی گیان کی باتیں اور وصایا اور وسائل کا اصل مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو اُن کی طبعی حالتوں سے جو وحشیانہ رنگ اپنے اندر رکھتی ہیں اخلاقی حالتوں تک پہنچائے اور پھر اخلاقی حالتوں سے رُوحانیت کے ناپیدا کنار دریا تک پہنچائے ۔

اور پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ طبعی حالات اخلاقی حالات سے کچھ الگ چیز نہیں بلکہ وُہی حالات ہیں جو تعدیل اور موقعہ و محل پر استعمال کرنے سے اور عقل کی تجویز اور مشورہ سے کام میں لانے سے اخلاقی حالات کا رنگ پکڑ لیتے ہیں ۔ اور قبل اس کے کہ وُہ عقل اور معرفت کی اصلاح اور مشورہ سے صادر ہوں ۔ گو وُہ کیسے ہی اخلاق سے مشابہ ہوں درحقیقت اخلاق نہیں ہوتے بلکہ طبیعت کی ایک بے اختیار رفتار ہوتی ہے ۔ جیسا کہ اگر ایک کُتّے یا ایک بکری سے اپنے مالک کے ساتھ محبّت یا انکسار ظاہر ہو تو اس کُتّے کو خلیق نہیں کہیں گے ۔ اور نہ اُس بکری کا نام مہذّب الاخلاق رکھیں گے ۔ اسی طرح ہم ایک بھیڑیئے یا شیر کو اُن کی درندگی کی وجہ سے بدخُلق نہیں کہیں گے ۔ بلکہ جیسا کہ ذِکر کیا گیا اخلاقی حالت محل اور سوچ اور وقت شناسی کے بعد شرُوع ہوتی ہے اور ایک ایسا انسان جو عقل اور تدبیر سے کام نہیں لیتا وُہ اُن شیر خوار بچّوں کی

طرح ہے جن کے دِل و دماغ پر ہنوز قوّتِ عقلیہ کا سایہ نہیں پڑا۔ یا اُن دیوانوں کی طرح جو جوہرِ عقل اور دانش کو کھو بیٹھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص بچّہ، شیر خوار اور دیوانہ ہو وُہ ایسی حرکات بعض اوقات ظاہر کرتا ہے کہ جو اخلاق کے ساتھ مشابہ ہوتی ہیں مگر کوئی عقلمند ان کا نام اخلاق نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ وُہ حرکتیں تمیز اور موقع بینی کے چشمے سے نہیں نکلتیں۔ بلکہ وہ طبعی طور پر تحریکوں کے پیش آنے کے وقت صادر ہوتی جاتی ہیں۔ جیسا کہ انسان کا بچّہ پیدا ہوتے ہی ماں کی چھاتیوں کی طرف رُخ کرتا ہے۔ اور ایک مُرغ کا بچّہ پیدا ہوتے ہی دانہ چُگنے کیلئے دَوڑتا ہے۔ جوک کا بچّہ جوک کی عادتیں اپنے اندر رکھتا ہے اور سانپ کا بچّہ سانپ کی عادتیں ظاہر کرتا ہے اور شیر کا بچّہ شیر کی عادتیں دِکھلاتا ہے۔ بالخصوص انسان کے بچّے کو غور سے دیکھنا چاہیئے کہ وُہ کیسے پیدا ہوتے ہی انسانی عادتیں دِکھلانا شُروع کر دیتا ہے۔ اور پھر جب برس ڈیڑھ برس کا ہُوا تو وُہ عاداتِ طبعیہ بہُت نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً پہلے جس طور سے روتا تھا اب رونا بہ نسبت پہلے کے کسی قدر بلند ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہنسنا قہقہہ کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور آنکھوں میں بھی عمداً دیکھنے کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس عُمر میں یہ ایک اَور امرِ طبعی پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی رضامندی یا نارضامندی حرکات سے ظاہر کرتا ہے اور کسی کو مارنا اور کسی کو کچھ دینا چاہتا ہے۔ مگر یہ تمام حرکات دراصل طبعی ہوتی ہیں۔ پس ایسے بچّہ کی مانند ایک وحشی آدمی بھی ہے جس کو انسانی تمیز سے بہت ہی کم حصہ ملا ہے۔ وُہ بھی اپنے ہر ایک قول اور فعل اور حرکت اور سکون میں طبعی حرکات ہی دِکھلاتا ہے اور اپنی طبیعت کے جذبات کا تابع رہتا ہے۔

کوئی بات اس کے اندرونی قویٰ کے تدبّر اور تفکّر سے نہیں نکلتی بلکہ جو کچھ طبعی طور پر اس کے اندر پیدا ہُوا ہے وُہ خارجی تحریکوں کے مناسبِ حال نِکلتا چلا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس کے طبعی جذبات جو اس کے اندر سے کسی تحریک سے باہر آتے ہیں وُہ سب کے سب بُرے نہ ہوں بلکہ بعض اُن کے نیک اخلاق سے مشابہ ہوں۔ لیکن عاقلانہ تدبّر اور موشگافی کو ان میں دخل نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی قدر ہو بھی تو وُہ بوجہ غلبۂ جذباتِ طبعی کے قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔ بلکہ جس طرف کثرت ہے اسی طرف کو مُعتبر سمجھا جائیگا ؁

حقیقی اخلاق

غرض ایسے شخص کی طرف حقیقی اخلاق منسوب نہیں کر سکتے جس پر جذباتِ طبیعہ حیوانوں اور بچوّں اور دیوانوں کی طرح غالب ہیں۔ اور جو اپنی زندگی کو قریب قریب وحشیوں کے بسر کرتا ہے بلکہ حقیقی طور پر نیک یا بداخلاق کا زمانہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہے کہ جب انسان کی عقلِ خُداداد پُختہ ہو کر اس کے ذریعہ سے نیکی اور بدی یا دو بدیوں یا دو نیکیوں کے درجہ میں فرق کر سکے۔ پھر اچھے راہ کے ترک کرنے سے اپنے دِل میں ایک حسرت پاوے اور بُرے کام کے ارتکاب سے اپنے تئیں متندّم اور پشیمان دیکھے۔ اور یہ انسان کی زِندگی کا دُوسرا زمانہ ہے جس کو خدا کے پاک کلام قرآن شریف میں نفسِ لوّامہ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ ایک وحشی کو نفسِ لوّامہ کی حالت تک پہنچانے کے لئے صرف سرسری نصائح کافی نہیں ہوتیں۔ بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کو خُداشناسی

کا اس قدر حصّہ ملے۔ جس سے وہ اپنی پیدائش بے ہُودہ اور لغو خیال نہ کرے تا معرفتِ الٰہی سے سچّے اخلاق اس میں پیدا ہوں۔ اِسی وجہ سے خُدا تعالیٰ نے ساتھ ساتھ سچّے خُدا کی معرفت کے لئے توجّہ دِلائی ہے اور یقین دلایا ہے کہ ہر ایک عمل اور خلق ایک نتیجہ رکھتا ہے جو اس کی زِندگی میں رُوحانی راحت یا رُوحانی عذاب کا مُوجب ہوتا ہے۔ اور دُوسری زِندگی میں کھُلے کھُلے طور پر اپنا اثر دِکھلائے گا۔ غرض نفسِ لوّامہ کے درجہ پر انسان کو عقل اور معرفت اور پاک کانشنس سے اِس قدر حصّہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ بُرے کام پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے اور نیک کام کا خواہشمند اور حریص رہتا ہے۔ یہ وُہی درجہ ہے کہ جس میں انسان اخلاقِ فاضلہ حاصل کرتا ہے ؎

خَلق اور خُلق

اِس جگہ بہتر ہوگا کہ میَں خُلق کے لفظ کی بھی کسی قدر تعریف کر دُوں۔ سو جاننا چاہیئے کہ خَلق خا کی فتح سے ظاہری پیدائش کا نام ہے۔ اور خُلق خا کے ضمّہ سے باطنی پیدائش کا نام ہے۔ اور چونکہ باطنی پیدائش اخلاق سے ہی کمال کو پہنچتی ہے۔ نہ صرف طبعی جذبات سے۔ اِس لئے اخلاق پر ہی یہ لفظ بولا گیا ہے۔ طبعی جذبات پر نہیں بولا گیا۔ اور پھر یہ بات بھی بیان کر دینے کے لائق ہے کہ جیسا کہ عوام النّاس خیال کرتے ہیں کہ خُلق صرف حلیمی اور نرمی اور انکساری کا نام ہے۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔ بلکہ جو کچھ بمقابلہ ظاہری اعضاء کے باطن میں انسانی کمالات کی

کیفیتیں رکھی گئی ہیں۔ ان سب کیفیتوں کا نام خُلق ہے۔ مثلاً انسان آنکھ سے روتا ہے۔ اور اس کے مقابل پر دِل میں ایک قُوّتِ رقّت ہے۔ وہ جب بذریعہ عقلِ خُداداد کے اپنے محل پر مستعمل ہو تو وُہ ایک خُلق ہے۔ ایسا ہی انسان ہاتھوں سے دُشمن کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور اس حرکت کے مقابل پر دِل میں ایک قُوّت ہے جس کو شجاعت کہتے ہیں۔ پس جب انسان محل پر اور موقع کے لحاظ سے اس قوّت کو استعمال میں لاتا ہے تو اس کا نام بھی خُلق ہے۔ اور ایسا ہی اِنسان کبھی ہاتھوں کے ذریعہ سے مظلُوموں کو ظالموں سے بچانا چاہتا ہے۔ یا ناداروں اور بھُوکوں کو کچھ دینا چاہتا ہے یا کسی اور طرح سے بنی نوع کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور اس حرکت کے مقابل پر دِل میں ایک قوّت ہے جس کو رحم بولتے ہیں اور کبھی انسان اپنے ہاتھوں کے ذریعہ سے ظالم کو سزا دیتا ہے۔ اور اس حرکت کے مقابل پر دِل میں ایک قُوّت ہے جس کو انتقام کہتے ہیں۔ اور کبھی انسان حملہ کے مقابل پر حملہ کرنا نہیں چاھتا اور ظالم کے ظُلم سے درگذر کرتا ہے۔ اور اس حرکت کے مقابل پر دل میں ایک قُوّت ہے جس کو عفو اور صبر کہتے ہیں۔ اور کبھی انسان بنی نوع کو فائدہ پہنچانے کے لئے اپنے ہاتھوں سے کام لیتا ہے یا پیروں سے یا دل اور دماغ سے۔ اور ان کی بہبُودی کے لئے اپنا سرمایہ خرچ کرتا ہے۔ تو اس حرکت کے مقابل پر دِل میں ایک قُوّت ہے جس کو سخاوت کہتے ہیں۔ پس جب انسان ان تمام قوّتوں کو موقع اور محل کے لحاظ سے استعمال کرتا ہے۔ تو اس وقت اسکا نام خُلق رکھا جاتا ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ، ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مخاطب

کر کے فرماتا ہے :-

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (پ ۲۹ ع ۳)

یعنی تو ایک بزرگ خلق پر قائم ہے۔

سو اسی تشریح کے مطابق اس کے معنی ہیں یعنی یہ کہ تمام قسمیں اخلاق کی سخاوت شجاعت - عدل - رحم - احسان - صدق - حوصلہ وغیرہ تجھ میں جمع ہیں۔ غرض جس قدر انسان کے دِل میں قوّتیں پائی جاتی ہیں جیسا کہ ادب - حیا - دیانت - مروّت غیرت - استقامت عِفّت - زہادت - اعتدال - مواسات یعنی ہمدردی - ایسا ہی شجاعت سخاوت - عفو - صبر - احسان - صدق - وفا وغیرہ - جب یہ تمام طبعی حالتیں عقل اور تدبّر کے مشورہ سے اپنے اپنے محل اور موقع پر ظاہر کی جائیں گی تو سب کا نام اخلاق ہوگا - اور یہ تمام اخلاق درحقیقت انسان کی طبعی حالتیں اور طبعی جذبات ہیں اور صرف اس وقت اخلاق کے نام سے موسوم ہوتے ہیں کہ جب محل اور موقع کے لحاظ سے بالارادہ ان کو استعمال کیا جائے چونکہ انسان کے طبعی خواص میں سے ایک یہ بھی خاصہ ہے کہ وُہ ترقی پذیر جاندار ہے اِس لئے وُہ سچّے مذہب کی پیروی اور نیک صحبتوں اور نیک تعلیموں سے ایسے طبعی جذبات کو اخلاق کے رنگ میں لے آتا ہے - اور یہ امر کسی اَور جاندار کے لئے نصیب نہیں ؂

اصلاحِ اوّل یعنی طبعی حالتیں

اب ہم من جملہ قرآن شریف کی اصلاحاتِ ثلاثہ کے پہلی اصلاح کو جو ادنیٰ

درجہ کی طبعی حالتوں کے متعلق ہے ذکر کرتے ہیں اور یہ اصلاح اخلاق کے شعبوں میں سے وُہ شعبہ ہے جو ادب کے نام سے موسوم ہے۔ یعنی وُہ ادب جس کی پابندی وحشیوں کو ان کی طبعی حالتوں کھانے پینے اور شادی کرنے وغیرہ تمدنی امُور میں مرکزِ اعتدال پر لاتی ہے اور اس زندگی سے نجات بخشتی ہے جو وحشیانہ اور چوپایوں یا درندوں کی طرح ہو۔ جیسا کہ اِن تمام آداب کے بارے میں اللہ جلّ شانہٗ قرآن شریف میں فرماتا ہے:۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ[1]۔ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا[2] وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (پ ۴ ع ۱۴)[3]

اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ[4] وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ[5] وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ[6] لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا

[1] پ۵ ع ۱۵، [2] پ۴ ع ۱۴، [3] ۵:۶، [4] ۴:۳۰، [5] ۶:۱۵۳؛

غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا[1]ؕ فَاِنْ لَّمْ
تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ
قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ[2] وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ
اَبْوَابِهَا[3] ۔ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ
رُدُّوْهَا[4] ۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ
مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ[5] ۝ حُرِّمَتْ
عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ
اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ
وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ[6] ۔
يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ[7]
وَاِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ
اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا[8] كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا
تُسْرِفُوْا[9] وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا[10] وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۔ وَالرُّجْزَ
فَاهْجُرْ[11] وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ[12]
تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى[13] وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا
فَاطَّهَّرُوْا[14] وَفِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ[15]

---

[1] ۲۴ : ۲۸ ، [2] ۲۴ : ۲۹ ، [3] ۱۲ : ۱۹ ، [4] ۴ : ۸۶ ، [5] ۵ : ۹۱
[6] ۵ : ۴ ، [7] ۵ : ۵ ، [8] ۵۸ : ۱۲ ، [9] ۵ : ۳۲ ، [10] ۳۳ : ۷۱ ،
[11] ۷۴ : ۵۴ ، [12] ۳۱ : ۲۰ ، [13] ۲ : ۱۵۸ ، [14] ۵ : ۷ ، [15] ۵۱ : ۲۰ ؛

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً ؕ[۱] وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَۃً ؕ[۲]

ترجمہ:- یعنی تم پر تمھاری مائیں حرام کی گئیں۔ اور ایسا ہی تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپیاں اور تمھاری خالائیں اور تمھاری بھتیجیاں اور تمھاری بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا اور تمھاری رضاعی بہنیں اور تمھاری بیویوں کی مائیں اور تمھاری بیویوں کے پہلے خاوند سے لڑکیاں جن سے تم ہم صحبت ہو چکے ہو۔ اور اگر تم اُن سے ہم صحبت نہیں ہوئے تو کوئی گناہ نہیں اور تمھارے حقیقی بیٹوں کی عورتیں اور ایسے ہی دو بہنیں ایک وقت میں۔ یہ سب کام جو پہلے ہوتے تھے آج تم پر حرام کئے گئے۔ یہ بھی تمھارے لئے جائز نہ ہوگا کہ جبراً عورتوں کے وارث بن جاؤ۔ یہ بھی جائز نہیں کہ تم اُن عورتوں کو نکاح میں لاؤ جو تمھارے باپوں کی بیویاں تھیں۔ جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔ پاکدامن عورتیں تم میں سے یا پہلے اہلِ کتاب میں سے تمھارے لئے حلال ہیں کہ ان سے شادی کرو۔ لیکن جب مہر قرار پا کر نکاح ہو جائے بدکاری جائز نہیں اور نہ چھپا ہوا یارانہ۔ عرب کے جاہلوں میں جس شخص کے اولاد نہ ہوتی تھی بعض میں یہ رسم تھی کہ اُن کی بیوی اولاد کے لئے دوسرے سے آشنائی کرتی۔ قرآن شریف نے اِس صورت کو حرام کر دیا۔ مسافحت اسی بدرسم کا نام ہے ☆

---

[۱] ۴:۴، [۲] ۴:۵؛

پھر فرمایا کہ تم خودکشی نہ کرو۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو اور دُوسرے کے گھروں میں وحشیوں کی طرح خود بخود بے اجازت نہ چلے جاؤ۔ اجازت لینا شرط ہے۔ اور جب تم دُوسروں کے گھروں میں جاؤ تو داخل ہوتے ہی السّلام علیکم کہو۔ اور اگر اُن گھروں میں کوئی نہ ہو تو جب تک کوئی مالکِ خانہ تمھیں اجازت نہ دے ان گھروں میں مت جاؤ۔ اور اگر مالکِ خانہ یہ کہے کہ واپس چلے جاؤ تو تُم واپس چلے جاؤ۔ اور گھروں میں دیواروں پر سے کُود کر نہ جایا کرو بلکہ گھروں میں ان گھروں کے دروازوں میں سے جاؤ۔ اور اگر تمھیں کوئی سلام کہے تو اس سے بہتر اور نیک تر اسکو سلام کہو۔ اور شراب اور قماربازی اور بُت پرستی اور شگون لینا یہ سب پلید اور شیطانی کام ہیں۔ اِن سے بچو۔ مُردار مت کھاؤ۔ خنزیر کا گوشت مت کھاؤ۔ بُتوں کے چڑھاوے مت کھاؤ۔ لاٹھی سے مارا ہُوا مت کھاؤ۔ گِر کے مرا ہُوا مت کھاؤ۔ سینگ لگنے سے مرا ہُوا مت کھاؤ۔ درندے کا پھاڑا ہُوا مت کھاؤ۔ بُت پر چڑھایا ہُوا مت کھاؤ۔ کیونکہ یہ سب مُردار کا حکم رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ پوچھیں کہ پھر کھائیں کیا ؛ تو جواب یہ دے کہ دُنیا کی تمام پاک چیزیں کھاؤ۔ صرف مُردار اور مُردار کے مشابہ اور پلید چیزیں مت کھاؤ ۔

اگر مجلسوں میں تمھیں کہا جائے کہ کشادہ ہو کر بیٹھو۔ یعنی دُوسروں کو جگہ دو تو جلد جگہ کشادہ کر دو تا دُوسرے بیٹھیں۔ اور اگر کہا جائے تم اُٹھ جاؤ تو پھر بغیر چوں و چرا کے اُٹھ جاؤ۔ گوشت دال وغیرہ سب چیزیں جو پاک ہوں بیشک کھاؤ۔ مگر ایک طرف کی کثرت مت کرو۔ اور اسراف اور

زیادہ خوری سے اپنے تئیں بچاؤ۔ لغو باتیں مت کیا کرو۔ محل اور موقعہ کی بات کیا کرو۔ اپنے کپڑے صاف رکھو۔ بدن کو اور گھر کو اور کوچہ کو اور ہر ایک جگہ کو جہاں تمھاری نشست ہو پلیدی اور مَیل کچیل اور کثافت سے بچاؤ یعنی غُسل کرتے رہو۔ اور گھروں کو صاف رکھنے کی عادت پکڑو۔ (باستثناءِ وقتِ ضرورت) چلنے میں بھی نہ بُہت تیز چلو اور نہ بُہت آہستہ۔ درمیان کو نگاہ رکھّو۔ نہ بُہت اُونچا بولا کرو نہ بہت نیچا۔ جب سفر کرو تو ہر ایک طور پر سفر کا انتظام کر لیا کرو۔ اور کافی زادِ راہ لے لیا کرو تا گداگری سے بچو۔ جنابت کی حالت میں غسل کر لیا کرو۔ جب روٹی کھاؤ تو سائل کو بھی دو اور کُتّے کو بھی ڈال دیا کرو اور دُوسرے پرند وغیرہ کو بھی۔ اگر موقع ہو تو یتیم لڑکیاں جن کی تم پرورش کرو ان سے نکاح کرنا مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ چونکہ وہ لاوارث ہیں شاید تمُھارا نفس اُن پر زیادتی کرے تو ماں باپ اور اقارب والی عورتیں کرو جو تمُھاری مؤدّب رہیں اور اُن کا تمھیں خوف رہے۔ ایک دو تین چار تک کر سکتے ہو بشرطیکہ اعتدال کرو۔ اور اگر اعتدال نہ ہو تو پھر ایک ہی پر کفایت کرو۔ گو ضرورت پیش آوے۔ چار کی حد جو لگا دی گئی ہے وہ اس مصلحت سے ہے کہ تا تم پُرانی عادت کے تقاضے سے افراط نہ کرو۔ یعنی صدہا تک نوبت نہ پہنچاؤ۔ یا یہ کہ حرام کاری کی طرف جُھک نہ جاؤ اور اپنی عورتوں کو مہر دو ۔

غرض یہ قرآن شریف کی پہلی اِصلاح ہے جس میں انسان کی طبعی حالتوں کو وحشیانہ طرِیقوں سے کھینچ کر انسانیت کے لوازم اور تہذیب کی طرف توجّہ دلائی

گئی ہے۔ اِس تعلیم میں ابھی اعلیٰ اخلاق کا کچھ ذکر نہیں صرف انسانیت کے آداب ہیں۔ اور ہم لکھ چکے ہیں کہ اس تعلیم کی یہ ضرورت پیش آئی تھی کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم جس قوم کی اصلاح کے لئے آئے تھے وُہ وحشیانہ حالت میں سب قوموں سے بڑھی ہُوئی تھی۔ کسی پہلو میں انسانیت کا طریق ان میں قائم نہیں رہا تھا۔ پس ضرور تھا کہ سب سے پہلے انسانیت کے ظاہری آداب ان کو سکھائے جاتے ؀

حُرمتِ خنزیر

ایک نکتہ اس جگہ یاد رکھنے کے لائق ہے۔ اور وُہ نکتہ یہ ہے کہ خنزیر جو حرام کیا گیا ہے خُدا نے ابتدا سے اس کے نام میں ہی حُرمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ خنزیر کا لفظ خنز اور آر سے مرکب ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ مَیں اس کو بہت فاسد اور خراب دیکھتا ہوں۔ خنز کے معنے بہت فاسد اور آر کے معنی دیکھتا ہُوں۔ پس اس جانور کا نام جو ابتداء سے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہے وہی اس کی پلیدی پر دلالت کرتا ہے اور عجیب اتّفاق یہ ہے کہ ہندی میں اِس جانور کو سُؤر کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی سُو اور آر سے مُرکّب ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مَیں اس کو بہت بُرا دیکھتا ہُوں۔ اس سے تعجّب نہیں کرنا چاہیئے کہ سُؤ کا لفظ عربی کیونکر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم نے اپنی کتاب "منن الرحمٰن" میں ثابت کیا ہے کہ تمام زبانوں کی ماں عربی زبان ہے۔ اور عربی کے لفظ ہر ایک زبان میں نہ ایک د

بلکہ ہزاروں ملے ہوئے ہیں۔ سو سُوؔر عربی لفظ ہے۔ اسی لئے ہندی میں سُؤر کا ترجمہ بَدؔ ہے۔ پس اس جانور کو بَدؔ بھی کہتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانہ میں جب کہ تمام دُنیا کی زبان عربی تھی اس مُلک میں یہ نام اس جانور کا عربی میں مشہور تھا جو خنزیرؔ کے نام کے ہم معنی ہے۔ پھر اب تک یادگار باقی رہ گیا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ شاستری میں اس کے قریب قریب ہی لفظ متغیّر ہو کر اَور کچھ بن گیا ہو۔ مگر صحیح لفظ یہی ہے کیونکہ اپنی وجہ تسمیہ ساتھ رکھتا ہے جس پر لفظ خنزیرؔ گواہ ناطق ہے۔ اور یہ معنی جو اس لفظ کے ہیں یعنی بہت فاسد اس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اوّل درجہ کا نجاست خور اور نیز بے غیرت اور دیّوث ہے۔ اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ قانونِ قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے پلید اور بَد جانور کے گوشت کا اثر بھی بدن اور رُوح پر بھی پلید ہی ہو۔ کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ غذاؤں کا بھی انسان کی رُوح پر ضرور اثر ہوتا ہے۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسے بد کا اثر بھی بد ہی پڑے گا۔ جیسا کہ یُونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے ہی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس جانور کا گوشت بالخاصیت حیا کی قوّت کو کم کرتا ہے اور دیّوثی کو بڑھاتا ہے۔ اور مُردار کا کھانا بھی اسی لئے اِس شریعت میں منع ہے کہ مُردار بھی کھانے والے کو اپنے رنگ میں لاتا ہے۔ اور نیز ظاہری صحت کے لئے بھی مضر ہے۔ اور جن جانوروں کا خُون اندر ہی رہتا ہے جیسے گلا گھونٹا ہوُا یا لاٹھی سے مارا ہوُا یہ تمام جانور درحقیقت مُردار کے حُکم میں ہی ہیں۔ کیا مُردہ کا خُون اندر رہنے سے اپنی

حالت پر رہ سکتا ہے ؟ نہیں۔ بلکہ وُہ بوجہ مرطوب ہونے کے بہت جلد گندہ ہوگا۔ اور اپنی عفونت سے تمام گوشت کو خراب کرے گا۔ اور نیز خون کے کیڑے جو حال کی تحقیقات سے بھی ثابت ہوئے ہیں مرکر ایک زہرناک عفونت بدن میں پھیلا دیں گے ؛

اِنسان کی اخلاقی حالتیں!

دوسرا حصّہ قرآنی اصلاح کا یہ ہے کہ طبعی حالتوں کو شرائطِ مناسبہ کیساتھ مشروط کر کے اخلاقِ فاضلہ تک پہنچایا جائے۔ سو واضح ہو کہ یہ حصّہ بہت بڑا ہے اگر ہم اس حصّہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں یعنی تمام وُہ اخلاق اِس جگہ لکھنا چاہیں جو قرآن شریف نے بیان کئے تو یہ مضمون اس قدر لمبا ہو جائے گا کہ وقت اس کے دسویں حصّہ تک کو بھی کفایت نہیں کرے گا۔ اِس لئے چند اخلاقِ فاضلہ نمونے کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں ؛

اب جاننا چاہیئے کہ اخلاق دو قسم کے ہیں۔ اوّل وُہ اخلاق جن کے ذریعہ سے انسان ترکِ شر پر قادر ہوتا ہے۔ دُوسرے وہ اخلاق جن کے ذریعہ سے انسان ایصالِ خیر پر قادر ہوتا ہے۔ اور ترکِ شر کے مفہوم میں وُہ اخلاق داخل ہیں جن کے ذریعہ سے انسان کوشش کرتا ہے کہ تا اپنی زبان یا اپنے ہاتھ یا اپنی آنکھ یا اپنے کسی اور عضو سے دُوسرے کے مال یا عزت یا جان کو نقصان نہ پہنچاوے۔ یا نقصان رسانی اور کسرِ شان کا ارادہ نہ کرے۔ اور ایصالِ خیر کے مفہوم میں تمام وُہ اخلاق داخل ہیں جن کے ذریعہ سے انسان کوشش کرتا ہے کہ

اپنی زبان یا اپنے ہاتھ یا اپنے مال یا اپنے علم یا کسی اَور ذریعہ سے دُوسرے کے مال یا عزت کو فائدہ پہنچا سکے۔ یا اس کے جلال یا عزت ظاہر کرنے کا ارادہ کر سکے۔ یا اگر کسی نے اس پر کوئی ظلم کیا تھا تو جس سزا کا وُہ ظالم مستحق تھا اس سے درگذر کر سکے۔ اور اس طرح اس کو دُکھ اور عذاب بدنی اور تاوانِ مالی سے محفوظ رہنے کا فائدہ پہنچا سکے۔ یا اس کو ایسی سزا دے سکے جو حقیقت میں اس کے لئے سراسر رحمت ہے ؎

اخلاق متعلق ترکِ شر

اب واضح ہو کہ وُہ اخلاق جو ترکِ شر کے لئے صانعِ حقیقی نے مقرر فرمائے ہیں وہ زبانِ عربی میں جو تمام انسانی خیالات اور اوضاع اور اخلاق کے اظہار کے لئے ایک ایک مفرد لفظ اپنے اندر رکھتی ہے چار ناموں سے موسوم ہیں۔ چنانچہ

پہلا خلق **احصان** کے نام سے موسوم ہے۔ اور اس لفظ سے مُراد خاص وُہ پاک دامنی ہے جو مرد اور عورت کی قوتِ تناسل سے علاقہ رکھتی ہے اور محصن یا محصنہ اُس مرد یا اُس عورت کو کہا جائے گا جو حرام کاری یا اس کے مقدمات سے مجتنب رہ کر اس ناپاک بدکاری سے اپنے تئیں روکیں۔ جس کا نتیجہ دونوں کے لئے اِس عالم میں ذلّت اور لعنت اور دوسرے جہان میں عذابِ آخرت اور متعلقین کے لئے علاوہ بے آبروئی نقصانِ شدید ہے۔ مثلاً جو شخص کسی کی بیوی سے ناجائز حرکت کا مرتکب ہُوا یا مثلاً زنا تو نہیں مگر اس کے مقدمات

مرد اور عورت دونوں سے ظہور میں آویں تو کچھ شک نہیں کہ اس غیرت مند مظلوم کی ایسی بیوی کو جو زنا کرانے پر راضی ہوگئی تھی یا زنا بھی واقع ہو چکا تھا طلاق دینی پڑے گی۔ اور بچوں پر بھی اگر اس عورت کے پیٹ سے ہونگے بڑا تفرقہ پڑیگا۔ اور مالک خانہ یہ تمام نقصان اس بدذات کی وجہ سے اُٹھائیگا ۔

اس جگہ یاد رہے کہ یہ خُلق جس کا نام احصان یا عفّت ہے یعنی پاکدامنی۔ یہ اسی حالت میں خُلق کہلائیگا جب کہ ایسا شخص جو بدنظری یا بدکاری کی استعداد اپنے اندر رکھتا ہے یعنی قُدرت نے وُہ قویٰ اُس کو دے رکھے ہیں جن کے ذریعہ سے اس جُرم کا ارتکاب ہو سکتا ہے اِس فعلِ شنیع سے اپنے تئیں بچائے اور اگر بباعث بچّہ ہونے یا نامرد ہونے یا خوجہ ہونے یا پیرِ فرتُوت ہونے کے یہ قوّت اُس میں موجود نہ ہو تو اس صُورت میں ہم اس کو اس خُلق سے جس کا نام احصان یا عفّت ہے موصوف نہیں کر سکتے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عفّت اور احصان کی اس میں ایک طبعی حالت ہے ۔ مگر ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ طبعی حالتیں خُلق کے کے نام سے موسوم نہیں ہو سکتیں ۔ بلکہ اس وقت خُلق کی مدّ میں داخل کی جائینگی جب کہ عقل کے زیرِ سایہ ہو کر اپنے محل پر صادر ہوں یا صادر ہونے کی قابلیت پیدا کر لیں ۔ لہٰذا جیسا کہ مَیں لکھ چکا ہُوں کہ بچے اور نامرد اور ایسے لوگ جو کسی تدبیر سے اپنے تئیں نامرد کر لیں اس خُلق کا مصداق نہیں ٹھہر سکتے ۔ گو بظاہر عفّت اور احصان کے رنگ میں اپنی زندگی بسر کریں بلکہ تمام صُورتوں میں اُن کی عفّت اور احصان کا نام طبعی حالت ہوگا نہ اَور کچھ ۔ اور چونکہ یہ ناپاک حرکت اور اس کے مقدمات جیسے مرد سے صادر ہو سکتے ہیں ویسے ہی عورت سے بھی

صادر ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا خدا کی پاک کتاب میں دونوں مرد اور عورت کیلئے یہ تعلیم فرمائی گئی ہے :-

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ[1] وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪[2] وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝[3] وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝[4]

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا ۝[5] وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ[6]

یعنی ایمانداروں کو جو مرد ہیں کہہ دے کہ آنکھوں کو نامحرم عورتوں کے دیکھنے سے بچائے رکھیں۔ اور ایسی عورتوں کو کھلے طور سے نہ دیکھیں جو شہوت کا محل ہو سکتی ہوں۔ اور ایسے موقعوں پر خوابیدہ نگاہ کی عادت پکڑیں اور اپنے ستر کی جگہ کو جس طرح ممکن ہو بچاویں۔ ایسا ہی کانوں کو نامحرموں سے بچاویں یعنی بیگانہ عورتوں کے گانے بجانے اور خوش الحانی کی آوازیں نہ سنیں۔

---

[1] ۲۴ : ۳۰ ، [2] ۲۴ : ۳۲ ، [3] ۲۴ : ۳۲ ، [4] ۱۷ : ۳۳ ، [5] ۲۴ : ۳۴ ، [6] ۵۷ : ۲۸ ؛

اُن کے حُسن کے قصّے نہ سُنیں ۔ یہ طریق پاک نظر اور پاک دل رہنے کے لئے عُمدہ طریق ہے ۔ ایسا ہی ایماندار عورتوں کو کہہ دے کہ وُہ بھی اپنی آنکھوں کو نامحرم مردوں کے دیکھنے سے بچائیں اور اپنے کانوں کو بھی نامحرموں سے بچائیں یعنی اُن کی پُرشہوات آوازیں نہ سُنیں اور اپنی ستر کی جگہ کو پردہ میں رکھیں ۔ اور اپنی زینت کے اعضاء کو کسی غیر محرم پر نہ کھولیں ۔ اور اپنی اوڑھنی کو اس طرح سر پر لیں کہ گریبان سے ہو کر سر پر آجائے ۔ یعنی گریبان اور دونوں کان اور سر اور کنپٹیاں سب چادر کے پردہ میں رہیں ۔ اور اپنے پیروں کو زمین پر ناچنے والوں کی طرح نہ ماریں ۔ یہ وُہ تدبیر ہے کہ جس کی پابندی ٹھوکر سے بچا سکتی ہے ۔

اور دُوسرا طریق بچنے کے لئے یہ ہے کہ خُدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس سے دُعا کریں تا ٹھوکر سے بچاوے اور لغزشوں سے نجات دے ۔ زنا کے قریب مت جاؤ ۔ یعنی ایسی تقریبوں سے دُور رہو جن سے یہ خیال بھی دل میں پیدا ہو سکتا ہو ۔ اور ان راہوں کو اختیار نہ کرو جن سے اِس گُناہ کے وقوع کا اندیشہ ہو ۔ جو زنا کرتا ہے وُہ بدی کو انتہا تک پہنچا دیتا ہے ۔ زنا کی راہ بہت بُری ہے یعنی منزلِ مقصود سے روکتی ہے اور تمہاری آخری منزل کے لئے سخت خطرناک ہے اور جس کو نکاح میسّر نہ آوے چاہئے کہ وہ اپنی عفّت کو دُوسرے طریقوں سے بچاوے مثلاً روزہ رکھے یا کم کھاوے یا اپنی طاقتوں سے تن آزار کام لے ۔ اور لوگوں نے یہ بھی طریق نکالے ہیں کہ وُہ ہمیشہ عمداً نکاح سے دست بردار رہیں یا خوجے بنیں اور کسی طریق سے

رہبانیت اختیار کریں۔ مگر ہم نے انسان پر یہ حکم فرض نہیں کئے۔ اسی لئے وہ ان بدعتوں کو پورے طور پر نبھا نہ سکے۔ خدا کا یہ فرمانا کہ ہمارا یہ حکم نہیں کہ لوگ خوجے بنیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا کا حکم ہوتا تو سب لوگ اس حکم پر عمل کرنے کے مجاز بنتے۔ تو اس صورت میں بنی آدم کی قطع نسل ہو کر کبھی کا دُنیا کا خاتمہ ہو جاتا۔ اور نیز اگر اس طرح پر عفت حاصل کرنی ہو کہ عضوِ مردمی کو کاٹ دیں تو یہ درپردہ اس صانع پر اعتراض ہے جس نے وُہ عضو بنایا۔ اور نیز جب کہ ثواب کا تمام مدار اس بات میں ہے کہ ایک قوّت موجود ہو اور پھر انسان خدائے تعالیٰ کا خوف کر کے اس قوت کے خراب جذبات کا مقابلہ کرتا رہے۔ اور اس کے منافع سے فائدہ اُٹھا کر دو طور کا ثواب حاصل کرے۔ پس ظاہر ہے کہ ایسے عضو کے ضائع کر دینے میں دونوں ثوابوں سے محروم رہا۔ ثواب تو جذبۂ مخالفانہ کے وجود اور پھر اس کے مقابلہ سے ملتا ہے۔ مگر جس میں بچّہ کی طرح وُہ قوّت ہی نہیں رہی اسکو کیا ثواب ملے گا۔ کیا بچہ کو اپنی عفّت کا ثواب مل سکتا ہے؟

پاکدامن رہنے کے لئے پانچ علاج

اِن آیات میں خدائے تعالےٰ نے خُلق احصان یعنی عفّت کے حاصل کرنے کے لئے صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی بلکہ انسان کو پاک دامن رہنے کے لئے پانچ علاج بھی بتلا دیئے ہیں۔ یعنی یہ کہ (۱) اپنی آنکھوں کو نامحرم پر نظر ڈالنے سے بچانا (۲) کانوں کو نامحرموں کی آواز سننے سے بچانا (۳) نامحرموں

کے قصّے نہ سُننا۔ اور (۴) ایسی تمام تقریبوں سے جن میں اس بدفعل کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اپنے تئیں بچانا (۵) اگر نکاح نہ ہو تو روزہ رکھنا وغیرہ ؀

اِس جگہ ہم بڑے دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ اعلیٰ تعلیم ان سب تدبیروں کے ساتھ جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں صرف **اسلام** ہی سے خاص ہے۔ اور اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے۔ اور وُہ یہ ہے کہ چونکہ انسان کی وُہ طبعی حالت جو شہوات کا منبع ہے جس سے انسان بغیر کسی کامل تغیّر کے الگ نہیں ہو سکتا یہی ہے کہ اس کے جذباتِ شہوت محل اور موقع پاکر جوش مارنے سے رہ نہیں سکتے۔ یا یُوں کہو کہ سخت خطرہ میں پڑ جاتے ہیں۔ اِس لئے خُدائے تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم نامحرم عورتوں کو بلاتکلّف دیکھ تو لیا کریں اور ان کی تمام زینتوں پر نظر ڈال لیں اور اُن کے تمام انداز ناچنا وغیرہ مشاہدہ کر لیں، لیکن پاک نظر سے دیکھیں۔ اور نہ یہ تعلیم ہمیں دی ہے کہ ہم ان بیگانہ جوان عورتوں کا گانا بجانا سُن لیں اور اُن کے حُسن کے قصّے بھی سُنا کریں۔ لیکن پاک خیال سے سُنیں۔ بلکہ ہمیں تاکید ہے کہ ہم نامحرم عورتوں کو اور اُن کی زینت کی جگہ کو ہرگز نہ دیکھیں، نہ پاک نظر سے اور نہ ناپاک نظر سے اور اُن کی خوش الحانی کی آوازیں اور اُن کے حُسن کے قصّے نہ سُنیں، نہ پاک خیال سے اور نہ ناپاک خیال سے۔ بلکہ ہمیں چاہیئے کہ اُن کے سُننے اور دیکھنے سے نفرت رکھیں جیسا کہ مُردار سے تا ٹھوکر نہ کھاویں۔ کیونکہ ضرور ہے کہ بے قیدی کی نظروں سے کسی وقت ٹھوکریں پیش آویں۔ سو چونکہ خُدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہماری آنکھیں اور دِل اور ہمارے خطرات سب پاک رہیں

اس لیئے اس نے یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم فرمائی۔ اس میں کیا شک ہے کہ بے قیدی ٹھوکر کا موجب ہو جاتی ہے۔ اگر ہم ایک بھوکے کُتّے کے آگے نرم نرم روٹیاں رکھ دیں اور پھر ہم اُمّید رکھیں کہ اِس کُتّے کے دِل میں خیال تک ان روٹیوں کا نہ آوے تو ہم اپنے اس خیال میں غلطی پر ہیں۔ سو خُدائے تعالیٰ نے چاہا کہ نفسانی قویٰ کو پوشیدہ کارروائیوں کا موقع بھی نہ ملے۔ اور ایسی کوئی بھی تقریب پیش نہ آئے جس سے بدخطرات جنبش کر سکیں ٭

اسلامی پردہ کی یہی فلاسفی اور یہی ہدایتِ شرعی ہے۔ خُدا کی کتاب میں پردہ سے یہ مُراد نہیں کہ فقط عورتوں کو قیدیوں کی طرح حراست میں رکھا جائے۔ یہ اُن نادانوں کا خیال ہے جن کو اسلامی طریقوں کی خبر نہیں۔ بلکہ مقصُود یہ ہے کہ عورت مرد دونوں کو آزاد نظر اندازی اور اپنی زینتوں کے دِکھانے سے روکا جائے۔ کیونکہ اس میں دونوں مرد اور عورت کی بھلائی ہے بالآخر یہ بھی یاد رہے کہ خوابیدہ نگاہ سے غیر محل پر نظر ڈالنے سے اپنے تئیں بچا لینا اور دُوسری جائز النظر چیزوں کو دیکھنا اِس طریق کو عربی میں غضِّ بصر کہتے ہیں۔ اور ہر ایک پرہیزگار جو اپنے دِل کو پاک رکھنا چاہتا ہے۔ اس کو نہیں چاہیئے کہ حیوانوں کی طرح جس طرف چاہے بے محابا نظر اُٹھا کر دیکھ لیا کرے۔ بلکہ اس کے لیئے اس تمدّنی زندگی میں غضِّ بصر کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ اور یہ وہ مُبارک عادت ہے جس سے اس کی یہ طبعی حالت ایک بھاری خلق کے رنگ میں آجائے گی۔ اور اس کی تمدّنی ضرورت میں بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہی وُہ خُلق ہے جس کو احصان اور عِفّت کہتے ہیں ٭

دوسری قسم ترکِ شر کے اقسام میں سے وہ خُلق ہے جس کو امانت و دیانت کہتے ہیں۔ یعنی دوسرے کے مال پر شرارت اور بدنیّتی سے قبضہ کر کے اس کو ایذاء پہنچانے پر راضی نہ ہونا۔ سو واضح ہو کہ دیانت اور امانت انسان کی طبعی حالتوں میں سے ایک حالت ہے۔ اسی واسطے ایک بچّہ شیر خوار بھی جو بوجہ کم سنی اپنی طبعی سادگی پر ہوتا ہے۔ اور نیز بباعث صغر سنی ابھی بُری عادتوں کا عادی نہیں ہوتا اِس قدر غیر کی چیز سے نفرت رکھتا ہے کہ غیر عورت کا دُودھ بھی مشکل سے پیتا ہے۔ اگر بے ہوشی کے زمانہ میں کوئی اور دایہ مقرر نہ ہو تو ہوش کے زمانہ میں اس کو دُوسرے کا دُودھ پلانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اپنی جان پر بہت تکلیف اُٹھاتا ہے اور ممکن ہے کہ اِس تکلیف سے مرنے کے قریب ہو جائے مگر دُوسری عورت کے دودھ سے طبعًا بیزار ہوتا ہے۔ اِس قدر نفرت کا کیا بھید ہے؟ بس یہی کہ وُہ والدہ کو چھوڑ کر غیر کی چیز کی طرف رجُوع کرنے سے طبعًا متنفر ہے۔ اب ہم جب ایک گہری نظر سے بچہ کی اِس عادت کو دیکھتے اور اس پر غور کرتے ہیں۔ اور فکر کرتے کرتے اس کی اس عادت کی تہ تک چلے جاتے ہیں تو ہم پر صاف کھل جاتا ہے کہ یہ عادت جو غیر کی چیز سے اس قدر نفرت کرتا ہے کہ اپنے اوپر مُصیبت ڈال لیتا ہے یہی جڑ دیانت اور امانت کی ہے۔ اور دیانت کے خُلق میں کوئی شخص راست باز نہیں ٹھہر سکتا جب تک بچّہ کی طرح وُہ غیر کے مال کے بارے میں بھی سچّی نفرت اور کراہت اُس کے دِل میں پیدا نہ ہو جائے۔ لیکن بچّہ اس عادت کو اپنے محل پر استعمال نہیں کرتا۔ اور اپنی بے وقوفی کے سبب سے بہت کُچھ تکلیفیں اٹھا لیتا ہے۔ لہٰذا اُس کی

یہ عادت صرف ایک حالتِ طبعی ہے جس کو وہ بے اختیار ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے وُہ حرکت اُسکے خلق میں داخل نہیں ہو سکتی۔ گو انسانی سرشت میں اصل جڑ خلق دیانت وامانت کی وُہی ہے جیسا کہ بچہ اس غیر معقول حرکت سے متدیّن اور امین نہیں کہلا سکتا ایسا ہی وُہ شخص بھی اِس خلق سے متصف نہیں ہو سکتا جو اس طبعی حالت کو محل پر استعمال نہیں کرتا۔ امین اور دیانت دار بننا بہت نازک امر ہے۔ جب تک اِنسان تمام پہلو بجا نہ لاوے امین اور دیانتدار نہیں ہو سکتا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے نمونہ کے طور پر آیات مفصلہ ذیل میں امانت کا طریق سمجھایا ہے اور وُہ طریق امانت یہ ہے:۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۤءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا وَمَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَیْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ۝ وَلْیَخْشَ الَّذِیْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّیَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَیْهِمْ فَلْیَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْیَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ

ؔ ۴: ۶، ۷

نَاراً وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْراً ۝

ترجمہ :- یعنی اگر کوئی ایسا تم میں مالدار ہو جو صحیح العقل نہ ہو مثلاً یتیم یا نابالغ ہو
اور اندیشہ ہو کہ وہ اپنی حماقت سے اپنے مال کو ضائع کر دیگا تو تم (بطور کورٹ
آف وارڈس کے) وہ تمام مال جس پر سلسلہ تجارت اور معیشت کا چلتا ہے ان
بے وقوفوں کے حوالہ مت کرو۔ اور اس مال میں سے بقدرِ ضرورت اُن
کے کھانے اور پہننے کے لئے دے دیا کرو۔ اور ان کو اچھّی باتیں قول معروف
کی کہتے رہو۔ یعنی ایسی باتیں جن سے اُن کی عقل اور تمیز بڑھے۔ اور ایک
طور سے اُن کے مناسب حال ان کی تربیت ہو جائے اور جاہل اور ناتجربکار
نہ رہیں۔ اگر وہ تاجر کے بیٹے ہیں تو تجارت کے طریقے اُن کو سکھلاؤ۔ اور
اگر کوئی اور پیشہ رکھتے ہوں تو اس پیشہ کے مناسب حال اُن کو پختہ
کر دو۔ غرض ساتھ ساتھ ان کو تعلیم دیتے جاؤ۔ اور اپنی تعلیم کا وقتاً فوقتاً
امتحان بھی کرتے جاؤ کہ جو کچھ تم نے سکھلایا اُنھوں نے سمجھا بھی ہے یا نہیں۔
پھر جب نکاح کے لائق ہو جائیں۔ یعنی عمر قریباً اٹھارہ برس تک پہنچ جائے۔
اور تم دیکھو کہ ان میں اپنے مال کے انتظام کی عقل پیدا ہو گئی ہے۔ تو اُن کا
مال اُن کے حوالہ کرو۔ اور فضول خرچی کے طور پر اُن کا مال خرچ نہ کرو۔ اور
نہ اِس خوف سے جلدی کر کے کہ اگر یہ بڑے ہو جائینگے تو اپنا مال لے لیں گے
اُن کے مال کا نقصان کرو۔ جو شخص دولتمند ہو اُس کو نہیں چاہیئے کہ اُن کے
مال میں سے کچھ حق الخدمت لیوے لیکن ایک محتاج بطور معروف لے سکتا

ے ۴ : ۹ - ۱۰ ،

ہے ؎

عرب میں مالی محافظوں کے لئے یہ طریق معروف تھا کہ اگر یتیموں کے کارپرداز اُن کے مال میں سے لینا چاہتے تو حتی الوسع یہ قاعدہ جاری رکھتے کہ جو کچھ یتیم کے مال کو تجارت سے فائدہ ہو اُس میں سے آپ بھی لیتے۔ رأس المال کو تباہ نہ کرتے۔ سو اسی عادت کی طرف اشارہ ہے کہ تم بھی ایسا کرو۔ اور پھر فرمایا کہ جب تم یتیموں کو مال واپس کرنے لگو تو گواہوں کے رُوبرو اُن کو اُن کا مال دو۔ اور جو شخص فوت ہونے لگے اور بچے اُس کے ضعیف اور صغیر السن ہوں تو اس کو نہیں چاہئے کہ کوئی ایسی وصیت کرے کہ جس میں بچوں کی حق تلفی ہو۔ جو لوگ ایسے طور سے یتیم کا مال کھاتے ہیں جس سے یتیم پر ظلم ہو جائے تو وہ مال نہیں بلکہ آگ کھاتے ہیں۔ اور آخر جلانے والی آگ میں ڈالے جائیں گے ؎

اب دیکھو خدائے تعالیٰ نے دیانت اور امانت کے کس قدر پہلو بتائے۔ سو حقیقی دیانت اور امانت وُہی ہے جو ان تمام پہلوؤں کے لحاظ سے ہو۔ اور اگر پُوری عقل مندی کو دخل دے کر امانت داری میں تمام پہلوؤں کا لحاظ نہ ہو تو ایسی دیانت اور امانت کئی طور سے چھپی ہُوئی خیانتیں اپنے ہمراہ رکھے گی۔ اور پھر دوسری جگہ فرمایا :-

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲: ۱۸۹)

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۝ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۝

یعنی آپس میں ایک دُوسرے کے مال کو ناجائز طور پر مت کھایا کرو۔ اور نہ اپنے مال کو رِشوت کے طور پر حُکّام تک پہنچایا کرو۔ تا اس طرح پر حُکّام کی اعانت سے دُوسرے کے مالوں کو دبا لو۔ امانتوں کو اُن کے حقداروں کو واپس دے دِیا کرو۔ خُدا خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ جب تُم ماپو تو پُورا ماپو۔ جب تُم وزن کرو تو پوری اور بے خلل ترازُو سے وزن کرو۔ اور کسی طور سے لوگوں کو اُن کے مال کا نقصان نہ پہنچاؤ اور فساد کی نیّت سے زمین پر مت پھرا کرو۔ یعنی اس نیّت سے کہ چوری کریں یا ڈاکہ ماریں یا کسی کی جیب کتریں یا کسی اور ناجائز طرِیق سے بیگانہ مال پر قبضہ کریں۔ اور پھر فرمایا کہ تم اچھّی چیزوں کے عوض میں خبیث اور ردّی چیزیں نہ دیا کرو۔ یعنی جس طرح دُوسروں کا مال دبا لینا ناجائز ہے اسی طرح خراب چیزیں بیچنا یا اچھّی کے عوض میں خبیث اور ردی چیزیں نہ دیا کرو۔ یعنی جس طرح دُوسروں کا مال دبا لینا ناجائز ہے اسی طرح خراب چیزیں بیچنا۔ اچھّی کے عوض میں بُری دینا بھی ناجائز ہے ؂

۱؎ ۴:۵۹، ۲؎ ۱۷:۲۶، ۳؎ ۷:۸۶، ۴؎ ۶۱:۲، ۵؎ ۴:۳؛

اِن تمام آیات میں خُدائے تعالیٰ نے تمام طریقے بددیانتی کے بیان فرما دِئے۔ اور ایسا کلام کُلّی کے طور پر فرمایا جس میں کسی بددیانتی کا ذِکر باہر نہ رہ جائے۔ صرف یہ نہیں کہا کہ تو چوری نہ کرتا ایک نادان یہ نہ سمجھ لے کہ چوری تو میرے لئے حرام ہے مگر دوسرے ناجائز طریقے سب حلال ہیں۔ اِس کلمۂ جامع کے ساتھ تمام ناجائز طریقوں کو حرام ٹھہرانا یہی حکمتِ بیانی ہے۔ غرض اگر کوئی اس بصیرت سے دیانت اور امانت کا خُلق اپنے اندر نہیں رکھتا اور ایسے تمام پہلوؤں کی رعائت نہیں کرتا وہ اگر دیانت اور امانت کو بعض امُور میں دِکھلاوے بھی تو یہ حرکت اس کی خُلق دیانت میں داخل نہیں سمجھی جائیگی۔ بلکہ ایک طبعی حالت ہوگی جو عقلی تمیز اور بصیرت سے خالی ہے ؁

تیسری قسم ترکِ شر کی اخلاق میں سے وُہ قسم ہے کہ جس کو عربی میں ھُدنہ اور ھون کہتے ہیں یعنی دوسرے کو ظُلم کی راہ سے بدنی آزار نہ پہنچانا اور بے شر انسان ہونا۔ اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا۔ پس بلاشُبہ صلح کاری اعلیٰ درجہ کا ایک خلق ہے اور انسانیت کے لئے ازبس ضروری۔ اور اس خُلق کے مناسب حال طبعی قوّت جو بچّہ میں ہوتی ہے جس کی تعدیل سے یہ خلق بنتا ہے اُلفت ہے۔ یعنی خوگرفتگی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان صرف طبعی حالت میں یعنی اِس حالت میں کہ جب انسان عقل سے بے بہرہ ہو صُلح کے مضمون کو سمجھ نہیں سکتا اور نہ جنگ جوئی کے مفہوم کو سمجھ سکتا ہے۔ پس اس وقت جو ایک عادت موافقت کی اس میں پائی جاتی ہے وُہی صُلح کاری کی عادت کی جڑ ہے۔ لیکن چونکہ وہ عقل اور تدبّر اور خاص ارادہ

سے اختیار نہیں کی جاتی اِس لئے خُلق میں داخل نہیں بلکہ خلق میں تب داخل ہوگی
کہ جب اِنسان بالارادہ اپنے تئیں بے شر بنا کر صلح کاری کے خُلق کو اپنے
محل پر استعمال کرے اور بے محل استعمال کرنے سے مجتنب رہے۔ اس
میں اللہ جلّ شانہٗ یہ تعلیم فرماتا ہے :۔

وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِکُمْ[1] اَلصُّلْحُ خَیْرٌ[2] وَاِنْ جَنَحُوْا
لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا[3] وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ
یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا[4] وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا
کِرَامًا[5] اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ
بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ[6]

یعنی آپس میں صلح کاری اختیار کرو۔ صلح میں خیر ہے۔ جب وہ صلح کی طرف جھکیں
تو تم بھی جُھک جاؤ۔ خُدا کے نیک بندے صلح کاری کے ساتھ زمین پر چلتے
ہیں۔ اور اگر کوئی لغوبات کسی سے سُنیں جو جنگ کا مقدمہ اور لڑائی کی ایک
تمہید ہو تو بزرگانہ طور پر طرح دے کر چلے جاتے ہیں اور ادنیٰ ادنیٰ بات پر
لڑنا شروع نہیں کر دیتے۔ یعنی جب تک کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے اس وقت
تک ہنگامہ پردازی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اور صلح کاری کے محل شناسی کا یہی
اصول ہے۔ کہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں کو خیال میں نہ لاویں اور معاف فرماویں
اور لغو کا لفظ جو اِس آیت میں آیا ہے سو واضح ہو کہ عربی زبان میں لغو اس
حرکت کو کہتے ہیں کہ مثلاً ایک شخص شرارت سے ایسی بکواس کرے۔ یا بہ نیتِ

---

[1] ۸ : ۲، [2] ۴ : ۱۲۹، [3] ۸ : ۶۳، [4] ۲۵ : ۶۴، [5] ۲۵ : ۷۳، [6] ۴۱ : ۳۵ ؛

ایذاء ایسا فعل اس سے صادر ہو کہ در اصل اس سے کچھ ایسا حرج اور نقصان نہیں پہنچتا۔ سو صلح کاری کی یہ علامت ہے کہ ایسی بے ہودہ ایذاء سے چشم پوشی فرماویں اور بزرگانہ سیرت عمل میں لاویں۔ لیکن اگر ایذاء صرف لغو کی مد میں داخل نہ ہو بلکہ اس سے واقعی طور پر جان یا مال یا عزّت کو ضرر پہنچے تو صلحکاری کے خلق کو اس سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ اگر ایسے گناہ کو بخشا جائے تو اس خُلق کا نام **عفو** ہے جس کا انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد بیان ہوگا۔ اور پھر فرمایا کہ جو شخص شرارت سے کچھ یاوہ گوئی کرے تو تم نیک طریق سے صلح کاری کا اسکو جواب دو۔ تب اس خصلت سے دشمن بھی دوست ہو جائیگا غرض صلح کاری کے طریق سے چشم پوشی کا محل صرف اِس درجہ کی بدی ہے جس سے کوئی واقعی نقصان نہ پہنچا ہو۔ صرف دشمن کی بیہودہ گوئی ہو ؕ

چوتھی قسم ترکِ شر کے اخلاق میں سے رفق اور قولِ حسن ہے۔ اور یہ خُلق جس حالتِ طبعی سے پیدا ہوتا ہے اس کا نام طلاقت یعنی کُشادہ رُوئی ہے۔ بچّہ جب تک کلام کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ بجائے رفق اور قولِ حسن کے طلاقت دِکھلاتا ہے۔ یہی دلیل اِس بات پر ہے کہ رفق کی جڑ جہاں سے شاخ پیدا ہوتی ہے طلاقت ہے۔ طلاقت ایک قوّت ہے اور رفق ایک خلق ہے جو اس قوّت کو محل پر استعمال کرنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں خدائے تعالیٰ کی تعلیم یہ ہے:۔

وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا[۱] لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی

---

[۱] ۲:۸۴

اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ[۱] اِجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ..... وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ[۲] وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا[۳]

ترجمہ :۔ یعنی لوگوں کو وُہ باتیں کہو جو واقعی طور پر نیک ہوں ۔ ایک قوم دُوسری قوم سے ٹھٹّا نہ کرے ۔ ہو سکتا ہے کہ جن سے ٹھٹّا کیا گیا ہے وہی اچھے ہوں ۔ بعض عورتیں بعض عورتوں سے ٹھٹّا نہ کریں ۔ ہو سکتا ہے کہ جن سے ٹھٹّا کیا گیا وہی اچھّی ہوں ۔ اور عیب مت لگاؤ ۔ اپنے لوگوں کے بُرے بُرے نام مت رکھو ۔ بدگمانی کی باتیں مت کرو ۔ اور نہ عیبوں کو کُرید کُرید کر پُوچھو ۔ ایک دُوسرے کا گِلہ مت کرو ۔ کسی کی نسبت وُہ بُہتان یا الزام مت لگاؤ جس کا تُمھارے پاس کوئی ثبوت نہیں ۔ اور یاد رکھو کہ ہر ایک عُضو سے مؤاخذہ ہوگا اور کان ، آنکھ ، دِل ہر ایک سے پُوچھا جائیگا ؛

ایصالِ خیر کے اقسام

اب ترکِ شر کے اقسام ختم ہو چکے ۔ اور اب ہم ایصالِ خیر کے اقسام بیان

---

[۱] ۴۹ : ۱۲ ، [۲] ۴۹ : ۱۳ ، [۳] ۱۷ : ۳۷ ؛

کرتے ہیں۔ **دُوسری قسم** اُن اخلاق کی جو ایصالِ خیر سے تعلّق رکھتے ہیں ؛
پہلا خلق ان میں سے **عفو** ہے یعنی کسی کے گُناہ کو بخش دینا۔ اس میں
ایصالِ خیر یہ ہے کہ جو گناہ کرتا ہے وُہ ایک ضرر پہنچاتا ہے۔ اور اس لائق
ہوتا ہے کہ اس کو بھی ضرر پہنچایا جائے۔ سزا دِلائی جائے۔ قید کرایا جائے۔
جُرمانہ کرایا جائے یا آپ ہی اس پر ہاتھ اُٹھایا جائے۔ پس اس کو بخش دینا
اگر بخش دینا مناسب ہو تو اُس کے حق میں ایصالِ خیر ہے۔ اس میں
قرآن شریف کی تعلیم یہ ہے :۔

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ[1]
جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ
فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ[2]

یعنی نیک آدمی وہ ہیں جو غُصّہ کھانے کے محل پر اپنا غُصّہ کھا جاتے ہیں۔
اور بخشنے کے محل پر گُناہ کو بخشتے ہیں۔ بدی کی جزا اسی قدر بدی ہے جو کی
گئی ہو۔ لیکن جو شخص گُناہ کو بخش دے اور ایسے موقعہ پر بخش دے کہ
اس سے کوئی اِصلاح ہوتی ہو۔ کوئی شر نہ پیدا ہوتا ہو۔ یعنی عین عفو کے
محل پر ہو نہ غیر محل پر تو اس کا وُہ بدلہ پائے گا ؛

اِس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم یہ نہیں کہ خواہ نخواہ اور ہر جگہ شر کا
مقابلہ نہ کیا جائے اور شریروں اور ظالموں کو سزا نہ دی جائے۔ بلکہ یہ تعلیم
ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ وُہ محل اور موقعہ گُناہ بخشنے کا ہے یا سزا دینے کا۔

---

[1] ۳ : ۱۳۴ ، [2] ۴۲ : ۴۱ ۔

پس مجرم کے حق میں اور نیز عامہ خلائق کے حق میں جو کچھ فی الواقعہ بہتر ہو وہی صورت اختیار کی جائے۔ بعض وقت ایک مجرم گناہ بخشنے سے توبہ کرتا ہے۔ اور بعض وقت ایک مجرم گناہ بخشنے سے اور بھی دلیر ہو جاتا ہے۔ پس خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اندھوں کی طرح گناہ بخشنے کی عادت مت ڈالو" بلکہ غور سے دیکھ لیا کرو کہ حقیقی نیکی کس بات میں ہے۔ آیا بخشنے میں یا سزا دینے میں۔ پس جو امر محل اور موقع کے مناسب ہو وہی کرو۔ افراد انسانی کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ جیسے بعض لوگ کینہ کشی پر بہت حریص ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ دادوں پردادوں کے کینوں کو یاد رکھتے ہیں۔ ایسا ہی بعض لوگ عفو اور درگذر کی عادت کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں اور بسا اوقات اس عادت کے افراط سے دیوثی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور ایسے قابلِ شرم حلم اور عفو اور درگذر ان سے صادر ہوتے ہیں جو سراسر حمیت اور غیرت اور عفت کے برخلاف ہوتے ہیں۔ بلکہ نیک چلنی پر داغ لگاتے ہیں۔ اور ایسے عفو اور درگذر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ توبہ توبہ کر اُٹھتے ہیں۔ انہیں خرابیوں کے لحاظ سے قرآن کریم میں ہر ایک خُلق کے لئے موقع اور محل کی شرط لگا دی ہے اور ایسے خُلق کو منظور نہیں رکھا جو بے محل صادر ہو ؎

یاد رہے کہ مجرّد عفو کو خلق نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ وُہ ایک طبعی قوّت ہے جو بچّوں میں پائی جاتی ہے۔ بچّہ کو جس کے ہاتھ سے چوٹ لگ جائے خواہ شرارت سے ہی لگے تھوڑی دیر کے بعد اِس قِصّہ کو بھُلا دیتا ہے اور پھر اُس کے پاس محبّت سے جاتا ہے۔ اور اگر اَیسے شخص نے اس کے قتل کا بھی ارادہ کیا ہو

تب بھی صرف میٹھی بات پر خوش ہو جاتا ہے پس ایسا عفو کسی طرح خُلق میں داخل نہیں ہوگا۔ خُلق میں اُسی صورت میں داخل ہوگا جب ہم اُس کو محل اور موقع پر استعمال کرینگے۔ ورنہ صرف ایک طبعی قوّت ہوگی۔ دُنیا میں بُہت تھوڑے ایسے لوگ ہیں جو طبعی قوّت اور خُلق میں فرق کر سکتے ہیں۔ ہم بار بار کہہ چُکے ہیں کہ حقیقی خُلق اور طبعی حالتوں میں یہ فرق ہے کہ خُلق ہمیشہ محل اور موقع کی پابندی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اور طبعی قوّت بے محل بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ یُوں تو چارپایوں میں گائے بھی بے شر ہے اور بکری بھی دِل کی غریب ہے مگر ہم ان کو اسی سبب سے اِن خُلقوں سے متصّف نہیں کہہ سکتے کہ ان کو محل اور موقع کی عقل نہیں دی گئی۔ خُدا کی حِکمت اور خُدا کی سچّی اور کامل کتاب نے ہر ایک خُلق کے ساتھ محل اور موقعہ کی شرط لگا دی ہے ۞

دُوسرا خُلق اخلاق ایصالِ خیر میں سے عدل ہے۔ اور تیسرا احسان اور چوتھا ایتاءِ ذی القربیٰ۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ[1]

یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ حُکم ہے کہ نیکی کے مقابل پر نیکی کرو اور اگر عدل سے بڑھ کر احسان کا موقع اور محل ہو تو وہاں احسان کرو اور اگر احسان سے بڑھ کر قریبیوں کی طرح طبعی جوش سے نیکی کرنے کا محل ہو تو وہاں طبعی ہمدردی سے نیکی کرو۔ اور اس سے خُدا تعالیٰ منع فرماتا ہے کہ تم حدودِ اعتدال سے آگے

---

[1] ۱۶ : ۹۱ ،

گذر جاؤ یا احسان کے بارے میں مُنکرانہ حالت تُم سے صادر ہو جس سے عقل انکار کرے یعنی یہ کہ تُم بے محل احسان کرو یا برمحل احسان کرنے سے دریغ کرو۔ یا یہ کہ تم محل پر ایتاءِ ذِی القُربیٰ کے خُلق میں کچھ کمی اختیار کرو یا حد سے زیادہ رحم کی بارش کرو۔ اِس آیتِ کریمہ میں ایصالِ خیر کے تین درجوں کا بیان ہے :۔

اوّل یہ درجہ کہ نیکی کے مقابل پر نیکی کی جائے ۔ یہ تو کم درجہ ہے۔ اور ادنیٰ درجہ کا بھلا مانس آدمی بھی یہ خُلق حاصل کر سکتا ہے کہ اپنے نیکی کرنیوالوں کے ساتھ نیکی کرتا رہے ۔

دُوسرا درجہ اس سے مشکل ہے اور وہ یہ کہ ابتداءً آپ ہی نیکی کرنا اور بغیر کِسی کے حق کے احسان کے طور پر اس کو فائدہ پہنچانا ۔ اور یہ خُلق اوسط درجہ کا ہے ۔ اکثر لوگ غریبوں پر احسان کرتے ہیں ۔ اور احسان میں ایک یہ مخفی عیب ہے کہ احسان کرنے والا خیال کرتا ہے کہ مَیں نے احسان کیا ہے اور کم سے کم وُہ اپنے احسان کے عوض میں شُکریہ یا دُعا چاہتا ہے ۔ اور اگر کوئی ممنونِ منّت اس کا مخالف ہو جائے تو اس کا نام احسان فراموش رکھتا ہے ۔ بعض وقت اپنے احسان کی وجہ سے اس پر فوق الطاقت بوجھ ڈال دیتا ہے اور اپنا احسان اُس کو یاد دِلاتا ہے ۔ جیسا کہ احسان کرنے والوں کو خُدا تعالیٰ نے متنبّہ کرنے کے لئے فرمایا ہے :۔

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى[1]

یعنی اَے احسان کرنے والو ! اپنے صدقات کو جن کی صِدق پر بنا چاہئے

---

[1] ۲ : ۲۶۵ ،

احسان یاد دِلانے اور دُکھ دینے کے ساتھ برباد مت کرو۔ یعنی صدقہ کا لفظ صدق سے مشتق ہے۔ پس اگر دِل میں صدق اور اخلاص نہ رہے تو وہ صدقہ صدقہ نہیں رہتا بلکہ ایک ریاکاری کی حرکت ہوتی ہے۔ غرض احسان کرنیوالے میں یہ ایک خامی ہوتی ہے کہ کبھی غصّہ میں آکر اپنا احسان بھی یاد دِلا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے خدائے تعالیٰ نے احسان کرنے والوں کو ڈرایا۔

تیسرا درجہ ایصالِ خیر کا خدائے تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بالکل احسان کا خیال نہ ہو اور نہ شکرگزاری پر نظر ہو۔ بلکہ ایک ایسی ہمدردی کے جوش سے نیکی صادر ہو جیسا کہ ایک نہایت قریبی مثلاً والدہ محض ہمدردی کے جوش سے اپنے بیٹے سے نیکی کرتی ہے۔ یہ وہ آخری درجہ ایصالِ خیر کا ہے جس سے آگے ترقی کرنا ممکن نہیں۔ لیکن خدائے تعالیٰ نے اِن تمام ایصالِ خیر کی قسموں کو محل اور موقعہ سے وابستہ کر دیا ہے اور آیتِ موصُوفہ میں صاف فرما دِیا ہے کہ اگر یہ نیکیاں اپنے اپنے محل پر مستعمل نہیں ہوں گی تو پھر یہ بدیاں ہو جائیں گی۔ بجائے عدل فحشاء بن جائے گا۔ یعنی حد سے اِتنا تجاوز کرنا کہ ناپاک صُورت ہو جائے۔ اور ایسا ہی بجائے احسان کے منکر کی صُورت نکل آئے گی۔ یعنی وُہ صُورت جس سے عقل اور کانشنس انکار کرتا ہے۔ اور بجائے اِیتاءِ ذی القربیٰ کے بغی بن جائے گا۔ یعنی وُہ بے محل ہمدردی کا جوش ایک بُری صُورت پیدا کرے گا۔ اصل میں بغی اُس بارش کو کہتے ہیں جو حد سے زیادہ برس جائے اور کھیتوں کو تباہ کر دے۔ اور یا حقِ واجب سے افزونی کرنا بھی بغی ہے۔ غرض اِن تینوں

میں سے جو محل پر صادر نہیں ہوگا وہی خراب سیرت ہو جائیگی۔ اسی لئے ان تینوں کے ساتھ موقع اور محل کی شرط لگا دی ہے۔ اس جگہ یاد رہے کہ مجرّد عدل یا احسان یا ہمدردئ ذی القربیٰ کو خُلق نہیں کہہ سکتے بلکہ انسان میں یہ سب طبعی حالتیں اور طبعی قوّتیں ہیں کہ جو بچّوں میں بھی وجودِ عقل سے پہلے پائی جاتی ہیں۔ مگر خُلق کے لئے عقل شرط ہے۔ اور نیز یہ شرط ہے کہ ہر ایک طبعی قُوّت موقع اور محل پر استعمال ہو ۔

اور پھر **احسان** کے بارے میں اَور بھی ضروری ہدایتیں قرآن شریف میں ہیں۔ اور سب کو الف لام کے ساتھ جو خاص کرنے کے لئے آتا ہے استعمال فرماکر موقع اور محل کی رعایت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جیسا کہ وُہ فرماتا ہے :-

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَاكَسَبْتُمْ ..... وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ[1]۔ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ[2]۔ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ[3]۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝ .... وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝[4]

---

[1] ۲ : ۲۶۸ ، [2] ۲ : ۲۶۵ ، [3] ۲ : ۱۹۶ ، [4] ۷۶ : ۶ تا ۱۰ ؛

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۔[۱] اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ○[۲] وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۔[۳] وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔[۴] اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ ۔[۵] وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً ۔[۶] اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ○[۷] لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۔[۸] وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ○[۹] وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ○ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ

---

[۱] ۲ : ۱۷۸ ، [۲] ۲۵ : ۶۸ ، [۳] ۱۳ : ۲۲ ، [۴] ۵۱ : ۲۰ ، [۵] ۳ : ۱۳۵ ، [۶] ۱۳ : ۲۳ ،
[۷] ۹ : ۶۱ ، [۸] ۳ : ۹۳ ، [۹] ۱۷ : ۲۷ ؛

بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔[1]

ترجمہ یہ ہے کہ اَے ایمان والو! تم اِن مالوں میں سے لوگوں کو بطریق سخاوت یا احسان یا صدقہ وغیرہ دو جو تمہاری پاک کمائی ہے۔ یعنی جس میں چوری یا رشوت یا خیانت یا غبن کا مال یا ظلم کے روپیہ کی آمیزش نہیں۔ اور یہ قصد تمہارے دِل سے دُور رہے کہ ناپاک مال لوگوں کو دو۔ اور دُوسری بات یہ ہے کہ اپنی خیرات اور مروّت کو احسان رکھنے اور دُکھ دینے کے ساتھ باطل مت کرو یعنی اپنے ممنونِ منّت کو کبھی یہ نہ جتلاؤ کہ ہم نے تمھیں یہ دیا تھا اور نہ اس کو دُکھ دو کہ اِس طرح تمھارا احسان باطل ہوگا اور نہ ایسا طریق پکڑو کہ تم اپنے مالوں کو ریاکاری کے ساتھ خرچ کرو۔ خُدا کی مخلوق سے احسان کرو کہ خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو لوگ حقیقی نیکی کرنے والے ہیں اُن کو وُہ جام پلائے جائیں گے جن کی ملونی کافور کی ہو گی یعنی دُنیا کی سوزشیں اور حسرتیں اور ناپاک خواہشیں اُن کے دِل سے دُور کر دی جائیں گی۔ کافور کَفَرْ سے مشتق ہے اور کَفَرْ لغتِ عرب میں دبانے اور ڈھانکنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اُن کے ناجائز جذبات دبا دِئے جائیں گے اور پاک باطن ہو جائیں گے اور معرفت کی خنکی اُن کو پہنچے گی۔

پھر فرماتا ہے کہ وُہ لوگ قیامت کو اس چشمہ کا پانی پئیں گے جس کو وُہ آج اپنے ہاتھ سے چیر رہے ہیں۔ اس جگہ بہشت کی فلاسفی کا ایک گہرا راز بتلایا ہے جس کو سمجھنا ہو سمجھ لے۔ اور پھر فرمایا ہے کہ حقیقی نیکی

---

[1] ۴: ۳۷-۳۸؛

کرنے والوں کی یہ خصلت ہے کہ وُہ محض خُدا کی محبت کے لئے وُہ کھانے جو آپ پسند کرتے ہیں مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ یہ کام صرف اِس بات کیلئے کرتے ہیں کہ خُدا ہم سے راضی ہو اور اُس کے مُنّہ کے لئے یہ خِدمت ہے۔ ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارا شُکر کرتے پھرو۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ایصالِ خیر کی تیسری قِسم جو محض ہمدردی کے جوش سے ہے وُہ طریق بجا لاتے ہیں۔ سچے نیکوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ خدا کی رضاجوئی کے لئے اپنے قریبیوں کو اپنے مال سے مدد کرتے ہیں اور نیز اس مال میں سے یتیموں کے تعہد اور ان کی پرورش اور تعلیم وغیرہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور مسکینوں کو فقر و فاقہ سے بچاتے ہیں۔ اور مُسافروں اور سوالیوں کی خدمت کرتے ہیں اور ان مالوں کو غلاموں کے آزاد کرانے کے لئے اور قرضداروں کو سُبکدوش کرنے کے لئے بھی دیتے ہیں اور اپنے خرچوں میں نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگ دِلی کی عادت رکھتے ہیں اور میانہ روش چلتے ہیں۔ پیوند کرنے کی جگہ پر پیوند کرتے ہیں۔ اور خُدا سے ڈرتے ہیں اور اُن کے مالوں میں سوالیوں اور بے زبانوں کا حق بھی ہے۔ بے زبانوں سے مُراد کُتّے، بلّیاں، چڑیاں، بَیل، گدھے بکریاں اور دُوسری چیزیں ہیں۔ وُہ تکلیفوں اور کم آمدنی کی حالت میں اور قحط کے دِنوں میں سخاوت سے تنگ دِل نہیں ہوجاتے بلکہ تنگی کی حالت میں بھی اپنے مقدور کے موافق سخاوت کرتے رہتے ہیں۔ وُہ کبھی پوشیدہ

خیرات کرتے ہیں اور کبھی ظاہر۔ پوشیدہ اِس لئے کہ تا ریاکاری سے بچیں۔ اور ظاہر اِس لئے کہ تا دُوسروں کو ترغیب دیں۔ خیرات اور صدقات وغیرہ پر جو مال دِیا جائے اُس میں یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ پہلے جس قدر محتاج ہیں اُن کو دِیا جائے۔ ہاں جو خیرات کے مال کا تعہّد کریں یا اس کے لئے اِنتظام و اہتمام کریں ان کو خیرات کے مال سے کچھ مال مل سکتا ہے اور نیز کسی کو بدی سے بچانے کے لئے بھی اس مال میں سے دے سکتے ہیں۔ ایسا ہی وُہ مال غُلاموں کے آزاد کرنے کے لئے اور مُحتاج اور قرضداروں اور آفت زدہ لوگوں کی مدد کے لئے بھی اور دُوسری راہوں میں جو محض خُدا کے لئے ہوں وُہ مال خرچ ہوگا۔ تم حقیقی نیکی کو ہرگز نہیں پا سکتے جب تک کہ بنی نوع کی ہمدردی میں وُہ مال خرچ نہ کرو جو تمھارا پیارا مال ہے۔ غریبوں کا حق ادا کرو مسکینوں کو دو۔ مسافروں کی خدمت کرو۔ اور فضولیوں سے اپنے تئیں بچاؤ یعنی بیاہوں شادیوں میں اور طرح طرح کی عیّاشی کی جگہوں میں اور لڑکا پیدا ہونے کی رسوم میں جو اسراف سے مال خرچ کیا جاتا ہے اس سے اپنے تئیں بچاؤ۔ تم ماں باپ سے نیکی کرو اور قریبیوں سے اور یتیموں سے اور مسکینوں سے اور ہمسایہ سے جو تُمھارا قریبی ہے اور ہمسایہ سے جو تمھارا بیگانہ ہے اور مُسافر سے اور نوکر اور غلام اور گھوڑے اور بکری اور بیل اور گائے سے اور حیوانات سے جو تُمھارے قبضہ میں ہوں۔ کیونکہ خُدا کو جو تمھارا خُدا ہے یہی عادتیں پسند ہیں۔ وُہ لاپرواہوں اور خود غرضوں سے محبّت نہیں کرتا۔ اور ایسے لوگوں کو نہیں چاہتا جو بخیل ہیں اور لوگوں کو بُخل کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنے مال کو

چھپاتے ہیں یعنی محتاجوں کو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ؎

حقیقی شجاعت

اور منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے وُہ حالت ہے جو شجاعت سے مشابہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ شیر خوار بچّہ بھی اِسی قوّت کی وجہ سے کبھی آگ میں ہاتھ ڈالنے لگتا ہے۔ کیونکہ انسان کا بچّہ بباعث فطرتی جوہر غلبہ انسانیت کے ڈرانے والے نمونوں سے پہلے کسی چیز سے بھی نہیں ڈرتا۔ اِس حالت میں انسان نہایت بے باکی سے شیروں اور دُوسرے جنگلی درندوں کا بھی مقابلہ کرتا ہے۔ اور تنِ تنہا مقابلہ کے لئے کئی آدمیوں سے لڑنے کے لئے نکلتا ہے۔ اور لوگ جانتے ہیں کہ بڑا بہادر ہے۔ لیکن یہ صرف ایک طبعی حالت ہے کہ اور درندوں میں پیدا ہوتی ہے بلکہ کتّوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور حقیقی شجاعت جو محل اور موقع کے ساتھ خاص ہے اور جو اخلاقِ فاضلہ میں سے ایک خُلق ہے وُہ ان محل اور موقع کے امُور کا نام ہے جن کا نام خدائے تعالیٰ کے پاک کلام میں اِس طرح پر آیا ہے:۔

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ۔[1] وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ[2] اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ[3] وَلَا

---

[1] ۲ : ۱۷۸ ، [2] ۱۳ : ۲۳ ، [3] ۳ : ۱۷۴ ؛

تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ (۸: ۴۸)
یعنی بہادر وُہ ہیں کہ جب لڑائی کا موقعہ آپڑے یا اُن پر کوئی مُصیبت آپڑے تو بھاگتے نہیں۔ اُن کا صبر لڑائی اور سختیوں کے وقت میں خُدا کی رضامندی کے لئے ہوتا ہے اور اُس کے چہرہ کے طالب ہوتے ہیں نہ کہ بہادری دِکھانے کے۔ اُن کو ڈرایا جاتا ہے کہ لوگ تمھیں سزا دینے کے لئے اتفّاق کر گئے ہیں۔ سو تم لوگوں سے ڈرو۔ پس ڈرانے سے اَور بھی اُن کا اِیمان بڑھتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ خُدا ہمیں کافی ہے۔ یعنی ان کی شجاعت کُتّوں اور درندوں کی طرح نہیں ہوتی جو صرف طبعی جوش پر مبنی ہو۔ جس کا ایک ہی پہلو پر میل ہو۔ بلکہ اُن کی شجاعت دو پہلو رکھتی ہے۔ کبھی تو وُہ اپنی ذاتی شجاعت سے اپنے نفس کے جذبات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اس پر غالب آتے ہیں۔ اور کبھی جب دیکھتے ہیں کہ دُشمن کا مقابلہ قرینِ مصلحت ہے، تو نہ صرف جوشِ نفس سے بلکہ سچّائی کی مدد کیلئے دُشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مگر نہ اپنے نفس پر بھروسہ کر کے بلکہ خُدا پر بھروسہ کر کے بہادری دکھاتے ہیں اور اُن کی شجاعت میں خود بینی اور ریاکاری نہیں ہوتی اور نہ نفس کی پیروی۔ بلکہ ہر ایک پہلو سے خُدا کی رضا مقدّم ہوتی ہے ؁

اِن آیات میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ حقیقی شجاعت کی جڑ صبر اور ثابت قدمی ہے اور ہر ایک جذبۂ نفسانی یا بلا جو دُشمنوں کی طرح حملہ کرے اس کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنا اور بُزدِل ہو کر بھاگ نہ جانا یہی شجاعت ہے۔ سو انسان اور درندہ کی شجاعت میں بڑا فرق ہے۔ درندہ ایک ہی پہلو

پر جوش اور غضب سے کام لیتا ہے اور انسان جو حقیقی شجاعت رکھتا ہے وُہ مقابلہ اور ترکِ مقابلہ میں جو کچھ قرینِ مصلحت ہو وُہ اختیار کر لیتا ہے ٭

سچّائی

اور منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے جو اسکی فطرت کا خاصہ ہے سچّائی ہے۔ اِنسان جب تک کوئی غرضِ نفسانی اس کی محرّک نہ ہو جھُوٹ بولنا نہیں چاھتا اور جھُوٹ کے اختیار کرنے میں ایک طرح کی نفرت اور قبض اپنے دل میں پاتا ہے۔ اِسی وجہ سے جس شخص کا صریح جھُوٹ ثابت ہو جائے اس سے ناخوش ہوتا ہے اور اُس کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ لیکن صرف یہی طبعی حالت اخلاق میں داخل نہیں ہو سکتی بلکہ بچّے اور دیوانے بھی اس کے پابند رہ سکتے ہیں۔ سو اصل حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان ان نفسانی اغراض سے علیحدہ نہ ہو جو راست گوئی سے روک دیتے ہیں تب تک حقیقی طور پر راست گو نہیں ٹھہر سکتا۔ کیونکہ اگر انسان صرف ایسی باتوں میں سچ بولے جن میں اس کا چنداں حرج نہیں اور اپنی عزّت یا مال یا جان کے نقصان کے وقت جھُوٹ بول جائے اور سچ بولنے سے خاموش رہے تو اُسکو دیوانوں اور بچّوں پر کیا فوقیت ہے۔ کیا پاگل اور نابالغ لڑکے بھی ایسا سچ نہیں بولتے دُنیا میں ایسا کوئی بھی نہیں ہوگا کہ جو بغیر کسی تحریک کے خواہ نخواہ جھُوٹ بولے۔ پس ایسا سچ جو کسی نقصان کے وقت چھوڑا جائے حقیقی اخلاق میں ہرگز داخل نہیں ہوگا۔ سچ کے بولنے کا بڑا بھاری محل اور موقع وہی ہے جس میں اپنی

جان یا مال یا آبرو کا اندیشہ ہو۔ اس میں خدا کی تعلیم یہ ہے:۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ[1] وَلَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا[2] وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ[3] وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى[4] كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ[5] وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا[6] وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ[7] وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ[8] لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ[9]

ترجمہ:۔ بتوں کی پرستش اور جھوٹ بولنے سے پرہیز کرو۔ یعنی جھوٹ بھی ایک بت ہے جس پر یہ بھروسہ کرنے والا خدا کا بھروسہ چھوڑ دیتا ہے۔ سو جھوٹ بولنے سے خدا بھی ہاتھ سے جاتا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ جب تم سچی گواہی کے لئے بلائے جاؤ تو جانے سے انکار مت کرو اور سچی گواہی کو مت چھپاؤ۔ اور جو چھپائے گا اُس کا دل گنہگار ہے۔ اور جب تم بولو تو وہی بات مُنہ پر لاؤ جو سراسر سچ اور عدالت کی بات ہے۔ اگرچہ تم اپنے کسی قریبی پر گواہی دو۔ حق اور انصاف پر قائم ہو جاؤ۔ اور چاہئے کہ ہر ایک گواہی تمہاری خدا کے لئے ہو۔ جھوٹ مت بولو۔ اگرچہ سچ بولنے سے تمہاری جانوں کو نقصان پہنچے یا اس سے تمہارے ماں باپ کو ضرر پہنچے یا

---

[1] ۲۲ : ۳۱ ، [2] ۲ : ۲۸۳ ، [3] ۲ : ۲۸۴ ، [4] ۶ : ۱۵۲ ، [5] ۴ : ۱۳۵ ، [6] ۵ : ۸ ؛
[7] ۳۳ : ۳۶ ، [8] ۱۰۳ : ۲ ، [9] ۲۵ : ۷۳ ؛

اور قریبیوں کو جیسے بیٹے وغیرہ کو اور چاہیئے کہ کسی قوم کی دُشمنی تمھیں سچّی گواہی سے نہ روکے۔ سچّے مرد اور سچّی عورتیں بڑے بڑے اجر پائیں گے۔ ان کی عادت ہے کہ اَوروں کو بھی سچ کی نصیحت دیتے ہیں اور جھُوٹوں کی مجلسوں میں نہیں بیٹھتے۔

صبر

منجملہ انسان کے طبعی امُور کے ایک صَبر ہے جو اس کو ان مصیبتوں اور بیماریوں اور دُکھوں پر کرنا پڑتا ہے جو اس پر ہمیشہ پڑتے رہتے ہیں۔ اور انسان بُہت سے سیاپے اور جزع فزع کے بعد صبر اختیار کرتا ہے۔ لیکن جاننا چاہیئے کہ خُدا کی پاک کتاب کی رُو سے وُہ صبر اخلاق میں داخل نہیں ہے بلکہ وُہ ایک حالت ہے جو تھک جانے کے بعد ضرورتًا ظاہر ہو جاتی ہے۔ یعنی انسان کی طبعی حالتوں میں سے یہ بھی ایک حالت ہے کہ وُہ مصیبت کے ظاہر ہونے کے وقت پہلے روتا چیختا سر پیٹتا ہے۔ آخر بہت سا بُخار نکال کر جوش تھم جاتا ہے اور انتہا تک پہنچ کر پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔

پس یہ دونوں حرکتیں طبعی حالتیں ہیں ان کو خلق سے کچھ تعلّق نہیں۔ بلکہ اس کے متعلّق خُلق یہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے ہاتھ سے جاتی رہے تو اس کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھ کر کوئی شکایت مُنہ پر نہ لاوے۔ اور یہ کہہ کر کہ خُدا کا تھا خُدا نے لے لیا اور ہم اس کی رضا کے ساتھ راضی ہیں۔ اِس خُلق کے متعلّق خُدا تعالیٰ کا پاک کلام قرآن شریف ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے :-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُصِیْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ٥ [1]

یعنی اَے مومنو! ہم تمھیں اس طرح پر آزماتے رہیں گے کہ کبھی کوئی خوف ناک حالت تُم پر طاری ہوگی اور کبھی فقر و فاقہ تمھارے شاملِ حال ہوگا اور کبھی تُمھارا مالی نقصان ہوگا اور کبھی جانوں پر آفت آئے گی اور کبھی اپنی محنتوں میں ناکام رہوگے اور حسب المُراد نتیجے کوششوں کے نہیں نکلیں گے۔ اور کبھی تُمھاری پیاری اولاد مرے گی۔ پس ان لوگوں کو خوش خبری ہو کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچے تو وُہ کہتے ہیں کہ ہم خُدا کی چیزیں اور اس کی امانتیں اور اس کے مملوک ہیں۔ پس حق یہی ہے کہ جس کی امانت ہے اُس کی طرف رجوع کرے یہی لوگ ہیں جن پر خُدا کی رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو خدا کی راہ کو پا گئے۔

غرض اس خلق کا نام صبر اور رضاء بر رضاءِ الٰہی ہے اور ایک طور سے اس خُلق کا نام عدل بھی ہے۔ کیونکہ جب کہ خُدائے تعالےٰ انسان کی تمام زندگی میں اس کی مرضی کے موافق کام کرتا ہے اور نیز ہزارہا باتیں اس کی مرضی کے موافق ظہور میں لاتا ہے۔ اور انسان کی خواہش کے مطابق

---

[1] ۲ : ۱۵۷-۱۵۸

اِس قدر نعمتیں اس کو دے رکھّی ہیں کہ انسان شمار نہیں کر سکتا - تو پھر یہ شرط انصاف نہیں کہ اگر وُہ کبھی اپنی مرضی بھی منوانا چاہے تو انسان منحرف ہو - اور اس کی رضا کے ساتھ راضی نہ ہو اور چُوں و چرا کرے یا بے دین اور بے ادب ہو جائے ؂

ہمدردیٔ خلق

اور منجملہ انسان کے طبعی امُور کے جو اس کی طبیعت کے لازم حال ہیں ہمدردیٔ خلق کا ایک جوش ہے - قومی حمایت کا جوش بالطبع ہر ایک مذہب کے لوگوں میں پایا جاتا ہے - اور اکثر لوگ طبعی جوش سے اپنی قوم کی ہمدردی کیلئے دُوسروں پر ظُلم کر دیتے ہیں - گویا انہیں انسان نہیں سمجھتے - سو اِس حالت کو خُلق نہیں کہہ سکتے - یہ فقط ایک طبعی جوش ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حالتِ طبعی کوّوں وغیرہ پرندوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ ایک کوّے کے مرنے پر ہزارہا کوّے جمع ہو جاتے ہیں - لیکن یہ عادت انسانی اخلاق میں اس وقت داخل ہو گی جب کہ یہ ہمدردی ، انصاف اور عدل کی رعایت سے محل اور موقع پر ہو - اس وقت یہ ایک عظیم الشّان خُلق ہو گا - جس کا نام عربی میں مواسات اور فارسی میں ہمدردی ہے - اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے :-

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ

؎ ۵ : ۳ ،

وَلَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ[1] وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا[2] وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا۔[3]

یعنی اپنی قوم کی ہمدردی اور اعانت فقط نیکی کے کاموں میں کرنی چاہیئے اور ظلم اور زیادتی کے کاموں میں اُن کی اعانت ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔ اور قوم کی ہمدردی میں سرگرم رہو۔ تھکو مت اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے مت جھگڑو جو خیانت کرنے سے باز نہیں آتے۔ خُدا خیانت پیشہ لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔

ایک برتر ہستی کی تلاش

منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے جو اس کی فطرت کو لازم پڑی ہوئی ہیں۔ ایک برتر ہستی کی تلاش ہے۔ جس کے لئے اندر ہی اندر انسان کے دِل میں ایک کشش موجود ہے۔ اور اس تلاش کا اثر اسی وقت سے محسوس ہونے لگتا ہے جبکہ بچّہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے۔ کیونکہ بچّہ پیدا ہوتے ہی پہلے رُوحانی خاصیت اپنی جو دِکھاتا ہے وُہ یہی ہے کہ ماں کی طرف جُھکا جاتا ہے اور طبعًا ماں کی محبت رکھتا ہے۔ اور پھر جیسے جیسے حواس اس کے کُھلتے جاتے ہیں اور شگوفہ فطرت اس کا کِھلتا جاتا ہے یہ کششِ محبّت جو اس کے اندر چھپی ہوئی تھی اپنا رنگ و رُوپ نمایاں طور پر دِکھاتی چلی جاتی ہے۔ پھر تو

---

[1] ۴: ۱۰۵، [2] ۴: ۱۰۶، [3] ۴: ۱۰۸

یہ ہوتا ہے کہ بجز اپنی ماں کی گود کے کسی جگہ آرام نہیں پاتا۔ اور پورا آرام اس کا اسی کے کنارِ عاطفت میں ہوتا ہے۔ اور اگر ماں سے علیحدہ کر دیا جائے اور دُور ڈال دیا جائے تو تمام عیش اُس کا تلخ ہو جاتا ہے۔ اور اگرچہ اس کے آگے نعمتوں کا ایک ڈھیر ڈال دیا جاوے تب بھی وُہ اپنی سچّی خوشحالی ماں کی گود میں ہی دیکھتا ہے۔ اور اس کے بغیر کسی طرح آرام نہیں پاتا۔ سو وُہ کششِ محبّت جو اس کو اپنی ماں کی طرف پیدا ہوتی ہے وُہ کیا چیز ہے؟

درحقیقت یہ وُہی کشش ہے جو معبودِ حقیقی کے لئے بچّہ کی فطرت میں رکھّی گئی ہے۔ بلکہ ہر ایک جگہ جو انسان تعلّق محبّت پیدا کرتا ہے درحقیقت وہی کشش کام کر رہی ہے۔ اور ہر ایک جگہ جو یہ عاشقانہ جوش دِکھلاتا ہے درحقیقت اسی محبّت کا وُہ ایک عکس ہے۔ گویا دُوسری چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر ایک گُمشدہ چیز کو تلاش کر رہا ہے جس کا اب نام بھول گیا ہے۔ سو انسان کا مال یا اولاد یا بیوی سے محبّت کرنا یا کسی خوش آواز کے گیت کی طرف اسکی رُوح کا کھینچے جانا درحقیقت اسی گُم شدہ محبُوب کی تلاش ہے۔ اور چونکہ انسان اس دقیق در دقیق ہستی کو جو آگ کی طرح ہر ایک میں مخفی اور سب پر پوشیدہ ہے اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا۔ اور نہ اپنی ناتمام عقل سے اس کو پا سکتا ہے۔ اِس لئے اس کی معرفت کے بارے میں انسان کو بڑی بڑی غلطیاں لگی ہیں اور سہو کاریوں سے اس کا حق دُوسرے کو دیا گیا ہے۔ خدا نے قرآن شریف میں یہ خوب مثال دی ہے کہ دُنیا ایک ایسے شیش محل کی طرح ہے جس کی زمین کا فرش نہایت مصفّیٰ شیشوں سے کیا گیا ہے اور پھر

اُن شیشوں کے نیچے پانی چھوڑا گیا جو نہایت تیزی سے چل رہا ہے۔ اب ہر ایک نظر جو شیشوں پر پڑتی ہے وہ اپنی غلطی سے اُن شیشوں کو بھی پانی سمجھ لیتی ہے۔ اور پھر انسان اُن شیشوں پر چلنے سے ایسا ڈرتا ہے جیسا کہ پانی سے ڈرنا چاہیئے۔ حالانکہ وہ درحقیقت شیشے ہیں مگر صاف اور شفّاف۔ سو یہ بڑے بڑے اجرام جو نظر آتے ہیں جیسے آفتاب اور ماہتاب وغیرہ یہ وہی صاف شیشے ہیں جن کی غلطی سے پرستش کی گئی۔ اور اُن کے نیچے ایک اعلیٰ طاقت کام کر رہی ہے جو اِن شیشوں کے پردہ میں پانی کی طرح بڑی تیزی سے چل رہی ہے۔ اور مخلوق پرستوں کی نظر کی یہ غلطی ہے کہ انہیں شیشوں کی طرف اِس کام کو منسوب کر رہے ہیں جو ان کے نیچے کی طاقت دِکھلا رہی ہے۔ یہی تفسیر اس آیتِ کریمہ کی ہے:۔

اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ[1]

غرض چونکہ خُدا تعالیٰ کی ذات باوجود نہایت روشن ہونیکے پھر بھی نہایت مخفی ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی شناخت کے لئے صرف یہ نظامِ جسمانی جو ہماری نظروں کے سامنے ہے کافی نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ ایسے نظام پر مدار رکھنے والے باوجودیکہ اس ترتیب ابلغ اور محکم کو جو صدہا عجائبات پر مشتمل ہے نہایت غور کی نظر سے دیکھتے رہے بلکہ ہیئت اور طبعی اور فلسفہ میں وہ مہارتیں پیدا کیں کہ گویا زمین و آسماں کے اندر دھس گئے۔ مگر پھر بھی شکوک و شبہات کی تاریکی سے نجات نہ پا سکے۔ اور اکثر اُن کے طرح طرح کی خطاؤں میں مبتلا

---

[1] ۲۷: ۴۵،

ہو گئے۔ اور بیہودہ اوہام میں پڑکر کہیں کے کہیں چلے گئے۔ اور اگر انکو اس صانع کے وجود کی طرف کچھ خیال بھی آیا تو بس اسی قدر کہ اعلیٰ اور عمدہ نظام کو دیکھ کر یہ اُن کے دِل میں پڑا کہ اس عظیم الشان سلسلہ کا جو پُر حکمت نظام اپنے ساتھ رکھتا ہے کوئی پیدا کرنے والا ضرور چاہئے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ خیال ناتمام اور یہ معرفت ناقص ہے۔ کیونکہ یہ کہنا کہ اس سلسلہ کے لئے ایک خُدا کی ضرورت ہے اس دُوسرے کلام سے ہرگز مساوی نہیں کہ وہ خُدا درحقیقت ہے بھی۔ غرض یہ اُن کی صرف قیاسی معرفت تھی جو دِل کو اطمینان اور سکینت نہیں بخش سکتی اور نہ شکوک کو بکلّی دل پر سے اُٹھا سکتی ہے۔ اور نہ یہ ایسا پیالہ ہے جس سے وُہ پیاس معرفتِ تامہ کی بُجھ سکے جو انسان کی فِطرت کو لگائی گئی بلکہ ایسی معرفتِ ناقصہ نہایت پُرخطر ہوتی ہے۔ کیونکہ بُہت شور ڈالنے کے بعد پھر آخر ہیچ اور نتیجہ ندارد ہے ؎

غرض جب تک خود خُدائے تعالیٰ اپنے موجود ہونے کو اپنے کلام سے ظاہر نہ کرے جیسا کہ اس نے اپنے کلام سے ظاہر کیا۔ تب تک صرف کام کا ملاحظہ تسلّی بخش نہیں ہے۔ مثلاً اگر ہم ایک ایسی کوٹھڑی کو دیکھیں جس میں یہ بات عجیب ہو کہ اندر سے کُنڈیاں لگائی گئی ہیں تو اِس فعل سے ہم ضرور اوّل یہ خیال کریں گے کہ کوئی انسان اندر ہے جس نے اندر سے زنجیر کو لگایا ہے کیونکہ باہر سے اندر کی زنجیروں کو لگانا غیر ممکن ہے لیکن جب ایک مُدّت تک بلکہ برسوں تک باوجود بار بار آواز دینے کے اس انسان کی طرف سے کوئی آواز نہ آوے تو آخر یہ رائے ہماری کہ کوئی اندر ہے بدل جائیگی۔

اور یہ خیال کرینگے کہ اندر کوئی نہیں بلکہ کسی حکمتِ عملی سے اندر کی کُنڈیاں لگائی گئی ہیں۔ یہی حال ان فلاسفروں کا ہے جنھوں نے صرف فعل کے مشاہدہ پر اپنی معرفت کو ختم کر دیا ہے۔ یہ بڑی غلطی ہے جو خُدا کو ایک مُردہ کی طرح سمجھا جائے جس کو قبر سے نکالنا صرف انسان کا کام ہے۔ اگر خُدا اَیسا ہے جو صرف انسانی کوشش نے اس کا پتہ لگایا ہے تو ایسے خُدا کی نسبت ہماری سب اُمّیدیں عبث ہیں۔ بلکہ خدا تو وہی ہے جو ہمیشہ سے اور قدیم سے آپ اَنَا الْمَوْجُوْدُ کہہ کر لوگوں کو اپنی طرف بُلاتا رہا ہے۔ یہ بڑی گُستاخی ہوگی کہ ہم ایسا خیال کریں کہ اُس کی معرفت میں انسان کا احسان اس پر ہے۔ اور اگر فلاسفر نہ ہوتے تو وُہ گویا گُم کا گم ہی رہتا۔ اور یہ کہنا کہ خُدا کیونکر بول سکتا ہے۔ کیا اس کی زبان ہے؟ یہ بھی ایک بڑی بے باکی ہے۔ کیا اُس نے جسمانی ہاتھوں کے بغیر تمام آسمانی اجرام اور زمین کو نہیں بنایا۔ کیا وہ جسمانی آنکھوں کے بغیر دُنیا کو نہیں دیکھتا۔ کیا وہ جسمانی کانوں کے بغیر ہماری آوازیں نہیں سُنتا۔ پس کیا ضروری نہ تھا کہ اسی طرح وُہ کلام بھی کرے۔ یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے کہ خُدا کا کلام کرنا آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گیا ہے۔ ہم اسکے کلام اور مخاطبات پر کسی زمانہ تک مُہر نہیں لگاتے۔ بیشک وُہ اب بھی ڈھونڈنے والوں کو الہامی چشمہ سے مالامال کرنے کو تیّار ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ اور اب بھی اس کے فیضان کے اَیسے دروازے کھُلے ہیں جیسے کہ پہلے تھے۔ ہاں ضرورتوں کے ختم ہونے پر شریعتیں اور حدود ختم ہوگئیں اور تمام رسالتیں اور نبوّتیں اپنے آخری نقطہ پر آکر جو ہمارے سیّد و مولیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم

کا وجود تھا کمال کو پہنچ گئیں ⁂

آنحضرتؐ کے عرب سے ظاہر ہونے میں حکمت

اِس آخری نور کا عرب سے ظاہر ہونا بھی خالی حکمت سے نہ تھا۔ عرب وُہ بنی اسماعیلؑ کی قوم تھی جو اسرائیل سے منقطع ہو کر حکمتِ الٰہی سے بیابانِ فاران میں ڈال دی گئی تھی۔ اور فاران کے معنی ہیں دو فرار کرنے والے یعنی بھاگنے والے۔ پس جن کو خود حضرت ابراہیمؑ نے بنی اسرائیل سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اُنکا توریت کی شریعت میں کچھ حصّہ نہیں رہا تھا جیسا کہ لکھا ہے کہ وُہ اسحاق کے ساتھ حصّہ نہیں پائیں گے۔

پس تعلق والوں نے انھیں چھوڑ دیا اور کسی دُوسرے سے اُن کا تعلّق اور رشتہ نہ تھا اور دُوسرے تمام مُلکوں میں کُچھ کُچھ رسُوم عبادات اور احکام کی پائی جاتی تھیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ کسی وقت اُن کو نبیوں کی تعلیم پہنچی تھی۔ مگر صرف عرب کا مُلک ہی ایک ایسا ملک تھا جو اِن تعلیموں سے محض ناواقف تھا۔ اور تمام جہان سے پیچھے رہا ہُوا تھا۔ اس لئے آخر میں ان کی نوبت آئی اور اُس کی نبوّت عام ٹھہری۔ تا تمام مُلکوں کو دوبارہ برکات کا حصّہ دیوے اور جو غلطی پڑ گئی تھی اسکو نکال دے۔ پس ایسی کامل کتاب کے بعد کس کتاب کا انتظار کریں جس نے سارا کام انسانی اصلاح کا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور پہلی کتابوں کی طرح صرف ایک قوم سے واسطہ نہیں رکھا۔ بلکہ تمام قوموں کی اصلاح چاہی اور انسانی تربیت کے تمام مراتب بیان فرمائے۔ وحشیوں

کو انسانیت کے آداب سکھائے۔ پھر انسانی صورت بنانے کے بعد اخلاقِ
فاضلہ کا سبق دیا۔

قرآنِ کریم کا دُنیا پر احسان

یہ قرآن نے ہی دُنیا پر احسان کیا کہ طبعی حالتوں اور اخلاقِ فاضلہ میں فرق
کر کے دِکھلایا اور جب طبعی حالتوں سے نکال کر اخلاقِ فاضلہ کے محلِ عالی تک
پہنچایا تو فقط اسی پر کفایت نہ کی بلکہ اَور مرحلہ جو باقی تھا یعنی رُوحانی حالتوں
کا مقام اُس تک پہنچنے کے لئے پاک معرفت کے دروازے کھول دِئے۔
اور نہ صرف کھول دِئے بلکہ لاکھوں انسانوں کو اس تک پہنچا بھی دِیا۔ پس
اِس طرح پر تینوں قسم کی تعلیم جس کا مَیں پہلے ذکر کر چکا ہُوں کمال خُوبی سے
بیان فرمائی۔ پس چونکہ وُہ تمام تعلیموں کا جن پر دینی تربیّت کی ضرورتوں کا
مدار ہے کامل طور پر جامع ہے۔ اِس لئے یہ دعویٰ اُس نے کیا کہ مَیں نے
دائرۂ دینی تعلیم کو کمال تک پہنچایا۔ جیسا کہ وُہ فرماتا ہے:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ
نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا [۱]

یعنی آج مَیں نے دین تمہارا کامل کیا اور اپنی نعمت کو تم پر پُورا کر دیا۔ اور
مَیں تمہارا دِین اسلام ٹھہرا کر خوش ہُوا۔ یعنی دین کا انتہائی مرتبہ وُہ امر
ہے جو اسلام کے مفہوم میں پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ محض خُدا کے لئے ہو جانا

---

[۱] ۵ : ۴،

اور اپنی نجات اپنے وجود کی قُربانی سے چاہنا نہ اَور طریق سے۔ اور اس نیّت اور اس ارادہ کو عملی طور پر دکھلا دینا۔ یہ وُہ نقطہ ہے جس پر تمام کمالات ختم ہوتے ہیں۔ پس جس خدا کو حکیموں نے شناخت نہ کیا قرآن نے اُس سچّے خدا کا پتہ بتایا۔ قرآن نے خدا کی معرفت عطا کرنے کے لئے دوؔ طریق رکھے ہیں۔ اوّل وُہ طریق جس کی رُو سے انسانی عقل عقلی دلائل پیدا کرنے میں بہت قوی اور روشن ہو جاتی ہے اور غلطی کرنے سے بچ جاتی ہے۔ اور دُوسرا رُوحانی طریق ہے جس کو ہم تیسرے سوال کے جواب میں عنقریب انشاءاللہ تعالیٰ بیان کریں گے ٭

دلائل ہستیٔ باری تعالیٰ

اب دیکھو کہ عقلی طور پر قرآن شریف نے خدا کی ہستی پر کیا کیا عُمدہ اور بے مثل دلائل دِئے ہیں۔ جیسا کہ ایک جگہ فرماتا ہے :-

رَبُّنَا الَّذِیٓ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی [1]

یعنی خُدا وُہ خُدا ہے کہ جس نے ہر ایک شے کے مناسبِ حال اس کو پیدائش بخشی پھر اس شے کو اپنے کمالاتِ مطلوبہ حاصل کرنے کے لئے راہ دِکھلا دی۔ اب اگر اِس آیت کے مفہوم پر نظر رکھ کر انسان سے لیکر تمام بحری اور برّی جانوروں اور پرندوں کی بناوٹ تک دیکھا جائے تو خدا کی قدرت یاد آتی ہے کہ ہر ایک چیز کی بناوٹ اس کے مناسب حال معلوم ہوتی ہے۔ پڑھنے والے

---

[1] طٰہٰ ۲۰ : ۵۱ ،

خود سوچ لیں۔کیونکہ یہ مضمون بہت وسیع ہے ؀

دوسری دلیل خُدا تعالیٰ کی ہستی پر قرآن شریف نے خدائے تعالیٰ کا عِلّت العلل ہونا قرار دیا ہے۔جیسا کہ وہ فرماتا ہے :۔

وَاِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ؎

یعنی تمام سلسلہ علل و معلولات کا تیرے رب پر ختم ہو جاتا ہے۔تفصیل اِس دلیل کی یہ ہے کہ نظر تعمّق سے معلوم ہو گا کہ یہ تمام موجودات علل و معلول کے سلسلہ سے مربُوط ہے۔اور اسی وجہ سے دُنیا میں طرح طرح کے علوم پیدا ہو گئے ہیں کیونکہ کوئی حصّہ مخلوقات کا نظام سے باہر نہیں بعض بعض کے لئے بطور اصول اور بعض بطور فروع کے ہیں اور یہ تو ظاہر ہے کہ عِلّت یا تو خود اپنی ذات سے قائم ہوگی یا اس کا وجود کسی دُوسری عِلّت کے وجود پر منحصر ہو گا۔اور پھر یہ دُوسری عِلّت کسی اور عِلّت پر، وعلیٰ ہٰذا القیاس۔اور یہ تو جائز نہیں کہ اس محدود دُنیا میں علل و معلول کا سلسلہ کہیں جا کر ختم نہ ہو اور غیر متناہی ہو تو بالضّرورت ماننا پڑا کہ یہ سلسلہ ضرور کسی اخیر علّت پر جا کر ختم ہو جاتا ہے پس جس پر اس تمام کی انتہا ہے وہی خُدا ہے۔آنکھ کھول کر دیکھ لو کہ آیت وَاِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى اپنے مختصر لفظوں میں کس طرح اِس دلیل مذکورہ بالا کو بیان فرما رہی ہے۔جس کے یہ معنی ہیں کہ انتہا تمام سلسلہ کی تیرے رب تک ہے ؀

پھر ایک اَور دلیل اپنی ہستی پر یہ دی جیسا کہ فرماتا ہے :۔

؎ ۵۳ : ۴۳

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ ۝[۱]

یعنی آفتاب چاند کو پکڑ نہیں سکتا۔ اور نہ رات جو مظہرِ ماہتاب ہے دِن پر جو مظہر آفتاب ہے کچھ تسلّط کر سکتی ہے۔ یعنی کوئی ان میں سے اپنی حدودِ مقرّرہ سے باہر نہیں جاتا۔ اگر اُن پر درپردہ کوئی مُدبّر نہ ہو تو یہ تمام سلسلہ درہم برہم ہو جائے۔ یہ دلیل ہیئت پر غور کرنے والوں کے لئے نہایت فائدہ بخش ہے۔ کیونکہ اجرامِ فلکی کے اتنے بڑے عظیم الشّان اور بے شمار گولے ہیں جن کے تھوڑے سے بگاڑ سے تمام دُنیا تباہ ہو سکتی ہے۔ یہ کیسی قدرتِ حق ہے کہ وُہ آپس میں نہ ٹکراتے ہیں نہ بال بھر رفتار بدلتے اور نہ اتنی مدّت تک کام دینے سے کچھ گھِسے۔ اور نہ ان کی کلوں پُرزوں میں کچھ فرق آیا۔ اگر سر پر کوئی محافظ نہیں تو کیونکر اتنا بڑا کارخانہ بے شمار برسوں سے خود بخود چل رہا ہے۔ انہیں حکمتوں کی طرف اشارہ کرکے خدائے تعالیٰ دُوسرے مقام میں فرماتا ہے:۔

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝[۲]

یعنی کیا خُدا کے وجُود میں شک ہو سکتا ہے جس نے ایسے آسمان اور ایسی زمین بنائی۔

پھر ایک لطیف دلیل اپنی ہستی پر فرماتا ہے اور وُہ یہ ہے:۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۝[۳]

۱؎ ۳۶ : ۴۱ ، ۲؎ ۱۴ : ۱۱ ، ۳؎ ۵۵ : ۲۷، ۲۸ ؛

یعنی ہر ایک چیز معرضِ زوال میں ہے اور جو باقی رہنے والا ہے وُہ خُدا ہے جو جلال والا اور بزرگی والا ہے۔ اب دیکھو کہ اگر ہم فرض کر لیں کہ ایسا ہو کہ زمین ذرہ ذرہ ہو جائے اور اجرامِ فلکی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اور ان پر معدُوم کرنے والی ایک ایسی ہوا چلے جو تمام نشان ان چیزوں کے مٹا دے مگر پھر بھی عقل اس بات کو مانتی اور قبول کرتی ہے۔ بلکہ صحیح کانشنس اس کو ضروری سمجھتا ہے کہ اس تمام نیستی کے بعد بھی ایک چیز باقی رہ جائے جس پر فنا طاری نہ ہو اور تبدّل اور تغیر کو قبول نہ کرے اور اپنی پہلی حالت پر باقی رہے۔ پس وُہ وہی خُدا ہے جو تمام فانی صُورتوں کو ظہُور میں لایا۔ اور خود فنا کی دستبُرد سے محفُوظ رہا ؞

پھر ایک اَور دلیل اپنی ہستی پر قرآن شریف میں پیش کرتا ہے:۔

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى۔ [1]

یعنی مَیں نے رُوحوں کو کہا کہ کیا مَیں تمھارا رب نہیں؟ اُنھوں نے کہا۔ کیوں نہیں۔ اِس آیت میں خُدائے تعالیٰ قِصّہ کے رنگ میں رُوحوں کی اِس خاصیت کو بیان فرماتا ہے جو ان کی فطرت میں اُس نے رکھی ہُوئی ہے کہ کوئی رُوح فطرت کی رُو سے خدائے تعالیٰ کا انکار نہیں کر سکتی۔ صرف منکروں کو اپنے خیال میں دلیل نہ ملنے کی وجہ سے انکار ہے۔ مگر باوجُود اِس انکار کے وُہ اس بات کو مانتے ہیں کہ ہر ایک حادث کے واسطے ضرور ایک مُحدِث ہے۔ دُنیا میں ایسا کوئی نادان نہیں کہ اگر مثلاً بدن میں کوئی بیماری ظاہر ہو

---

[1] ۷:۱۷۳،

تو وُہ اِس بات پر اصرار کرے کہ در پردہ اِس بیماری کے ظہور کی کوئی عِلّت نہیں
اگر یہ سلسلہ دُنیا کا علل اور معلول سے مربُوط نہ ہوتا تو قبل از وقت یہ بتا دینا
کہ فلاں تاریخ طُوفان آئیگا یا آندھی یا خسُوف ہوگا یا کسوف ہوگا۔ یا فلاں
وقت بیمار مر جائیگا یا فلاں وقت تک بیماری کے ساتھ فلاں بیماری لاحق
ہو جائے گی۔ یہ تمام باتیں غیر ممکن ہو جاتیں۔ پس ایسا محقّق اگرچہ خُدا کے وجود
کا اقرار نہیں کرتا۔ مگر ایک طور سے تو اُس نے اقرار کر ہی دیا کہ وُہ بھی
ہماری طرح معلُولات کے لئے علل کی تلاش میں ہے۔ پس یہ بھی ایک قسم
کا اقرار ہے اگرچہ کامل اقرار نہیں۔ ماسوا اس کے اگر کسی ترکیب سے
ایک مُنکرِ وجود باری کو ایسے طور سے بے ہوش کیا جائے کہ وُہ اس سفلی
زِندگی کے خیالات سے بالکل الگ ہو کر اور تمام ارادوں سے معطّل رہ کر اعلیٰ
ہستی کے قبضہ میں ہو جائے تو وُہ اس صُورت میں خُدا کے وجُود کا اقرار
کرے گا انکار نہیں کرے گا۔ جیسا کہ اس پر بڑے بڑے مجرّبین کا تجربہ
ہے۔ سو ایسی حالت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اور مطلب آیت
یہ ہے کہ انکار وجودِ باری صرف سفلی زندگی تک ہے۔ ورنہ اصل فِطرت میں
اقرار بھرا ہُوا ہے ۞

صفاتِ باری تعالیٰ

یہ دلائل وجودِ باری ہیں جو ہم نے بطور نمُونہ کے لِکھ دِئے ہیں۔ بعد
اس کے یہ بھی جاننا چاہیئے کہ جس خُدا کی طرف ہمیں قرآن شریف نے بُلایا

ہے اس کی اُس نے یہ صفات لکھّی ہیں :-

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ [۱] مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ [۲] اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ [۳] هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ [۴] عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ [۵] رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ [۶] اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ [۷] اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ [۸] قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ [۹]

یعنی وُہ خُدا جو وحدہٗ لا شریک ہے جس کے سوا کوئی بھی پرستش اور فرمانبرداری کے لائق نہیں ۔ یہ اس لئے فرمایا کہ اگر وُہ لا شریک نہ ہو تو شاید اس کی طاقت پر دُشمن کی طاقت غالب آجائے ۔ اس صورت میں خُدائی معرضِ خطرہ میں رہے گی ۔ اور یہ جو فرمایا کہ اس کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں ۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ وُہ ایسا کامل خُدا ہے جس کی صفات اور خوبیاں اور کمالات ایسے اعلیٰ اور بلند ہیں کہ اگر موجودات میں سے بوجہ صفاتِ کاملہ

---

[۱] ۵۹ : ۲۳ ، [۲] ۱ : ۴ ، [۳] ۵۹ : ۲۴ ، [۴] ۵۹ : ۲۵ ، [۵] ۲ : ۲۱ ، [۶] ۱ : ۲-۳-۴ ، [۷] ۲ : ۱۸۷ ، [۸] ۲ : ۲۵۶ ، [۹] ۱۱۲ : ۱ تا ۴ ،

کے ایک خُدا انتخاب کرنا چاہیں یا دل میں عُمدہ سے عُمدہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خدا کی صفات فرض کریں تو وُہ سب سے اعلیٰ جس سے بڑھکر کوئی اعلیٰ نہیں ہو سکتا وُہی خُدا ہے جس کی پرستش میں ادنیٰ کو شریک کرنا ظلم ہے۔ پھر فرمایا کہ عالم الغیب ہے یعنی اپنی ذات کو آپ ہی جانتا ہے۔ اُسکی ذات پر کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہم آفتاب اور ماہتاب اور ہر ایک مخلُوق کو سراپا دیکھ سکتے ہیں مگر خُدا کا سراپا دیکھنے سے قاصر ہیں۔ پھر فرمایا کہ وُہ عالم الشّہادۃ ہے یعنی کوئی چیز اُسکی نظر سے پردہ میں نہیں ہے۔ یہ جائز نہیں کہ وُہ خدا کہلاکر پھر عِلمِ اشیاء سے غافل ہو۔ وُہ اس عالم کے ذرّہ ذرّہ پر اپنی نظر رکھتا ہے لیکن اِنسان نہیں رکھ سکتا۔ وُہ جانتا ہے کہ کب اس نظام کو توڑ دیگا اور قیامت برپا کردیگا اور اسکے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ایسا کب ہوگا؛ سو وُہی خدا ہے جو ان تمام وقتوں کو جانتا ہے۔ پھر فرمایا ھُوَ الرَّحْمٰن یعنی وُہ جانداروں کی ہستی اور اُنکے اعمال سے پہلے محض اپنے لُطف سے نہ کسی غرض سے اور نہ کسی عمل کی پاداش میں اُن کیلئے سامانِ راحت میسّر کرتا ہے جیسا کہ آفتاب اور زمین اور دُوسری تمام چیزوں کو ہمارے وجُود اور ہمارے اعمال کے وجُود سے پہلے ہمارے لئے بنا دیا۔ اس عطیّہ کا نام خدا کی کتاب میں رحمانیت ہے اور اس کام کے لحاظ سے خدا تعالیٰ رَحْمٰن کہلاتا ہے اور پھر فرمایا کہ اَلرَّحِیم یعنی وُہ خُدا نیک عملوں کی نیک تر جزا دیتا ہے اور کِسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اور اس کام کے لحاظ سے رَحِیم کہلاتا ہے۔ اور یہ صفت رحیمیت کے نام سے موسوم ہے۔ اور پھر فرمایا مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْن یعنی وُہ خُدا ہر ایک کی جزا اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ اس کا کوئی ایسا کارپرداز نہیں جس کو اس نے زمین و آسمان کی حکومت سونپ دی ہو

اور آپ الگ ہو بیٹھا ہو اور آپ کچھ نہ کرتا ہو ۔ وہی کار پرداز سب کچھ جزا سزا دیتا ہو یا آئندہ دینے والا ہو ۔ اور پھر فرمایا اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْس یعنی وُہ خُدا بادشاہ ہے جس پر کوئی داغِ عیب نہیں ۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی بادشاہت عیب سے خالی نہیں ۔ اگر مثلاً تمام رعیّت جلاوطن ہوکر دُوسرے مُلک کی طرف بھاگ جائے تو پھر بادشاہی قائم نہیں رہ سکتی ۔ یا اگر مثلاً تمام رعیّت قحط زدہ ہوجائے تو پھر خراجِ شاہی کہاں سے آئے ۔ اور اگر رعیّت کے لوگ اس سے بحث شروُع کر دیں کہ تجھ میں ہم سے زیادہ کیا ہے تو وُہ کون سی لیاقت اپنی ثابت کرے ۔ پس خُدا تعالیٰ کی بادشاہی ایسی نہیں ہے ۔ وُہ ایک دم میں تمام مُلک کو فنا کر کے اَور مخلُوقات پیدا کر سکتا ہے ۔ اگر وُہ ایسا خالق اور قادر نہ ہوتا تو پھر بجز ظُلم کے اس کی بادشاہت چل نہ سکتی ۔ کیونکہ وُہ دُنیا کو ایک مرتبہ معافی و نجات دے کر پھر دُوسری دنیا کہاں سے لاتا کیا نجات یافتہ لوگوں کو دُنیا میں بھیجنے کے لئے پھر پکڑتا اور ظُلم کی راہ سے اپنی معافی اور نجات دہی کو واپس لیتا ۔ تو اس صورت میں اس کی خُدائی میں فرق آتا ۔ اور دُنیا کے بادشاہوں کی طرح داغدار بادشاہ ہوتا جو دُنیا کے لئے قانون بناتے ہیں ، بات بات پر بگڑتے ہیں ۔ اور اپنی خود غرضی کے وقتوں پر جب دیکھتے ہیں کہ ظُلم کے بغیر چارہ نہیں تو ظُلم کو شیرِ مادر سمجھ لیتے ہیں ۔ مثلاً قانُونِ شاہی جائز رکھتا ہے کہ ایک جہاز کو بچانے کے لئے ایک کشتی کے سواروں کو تباہی میں ڈال دیا جائے ۔ اور ہلاک کیا جائے ۔ مگر خُدا کو تو یہ اضطرار پیش نہیں آنا چاہیئے ۔ پس اگر خدا

پُورا قادر اور عدم سے پیدا کرنے والا نہ ہوتا تو وہ یا تو کمزور راجوں کی طرح قدرت کی جگہ ظلم سے کام لیتا یا عادل بنکر خدائی کو ہی الوداع کہتا۔ بلکہ خدا کا جہاز تمام قدرتوں کے ساتھ سچے انصاف پر چل رہا ہے۔ پھر فرمایا اَلسَّلَامُ یعنی وُہ خدا جو تمام عیبوں اور مصائب اور سختیوں سے محفوظ ہے بلکہ سلامتی دینے والا ہے۔ اس کے معنی بھی ظاہر ہیں۔ کیونکہ اگر وُہ آپ ہی مصیبتوں میں پڑتا لوگوں کے ہاتھ سے مارا جاتا اور اپنے ارادوں میں ناکام رہتا تو اس بدنمونہ کو دیکھ کر کس طرح دل تسلّی پکڑتے کہ ایسا خدا ہمیں ضرور مصیبتوں سے چھڑا دے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ باطل معبودوں کے بارہ میں فرماتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِاجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ○ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○ ✱

جن لوگوں کو تم خدا بنائے بیٹھے ہو وُہ تو ایسے ہیں کہ اگر سب مل کر ایک مکھّی پیدا کرنا چاہیں تو کبھی پیدا نہ کرسکیں۔ اگرچہ ایک دُوسرے کی مدد بھی کریں۔ بلکہ اگر مکھی اُن کی چیز چھین کرلے جائے تو انھیں طاقت نہیں ہوگی کہ وُہ مکھّی سے چیز واپس لے سکیں۔ اُن کے پرستار عقل کے کمزور اور وُہ طاقت کے کمزور ہیں۔ کیا خدا ایسے ہُوا کرتے ہیں؟ خدا تو وُہ ہے کہ سب قوتوں والوں سے زیادہ قوت والا اور سب پر غالب آنے والا ہے۔ نہ اُس کو

✱ الحج ۲۲: ۷۴، ۷۵۔

کوئی پکڑ سکے اور نہ مار سکے۔ ایسی غلطیوں میں جو لوگ پڑتے ہیں وُہ خُدا کی قدر نہیں پہچانتے اور نہیں جانتے خُدا کیسا ہونا چاہئے۔ اور پھر فرمایا کہ خُدا امن کا بخشنے والا اور اپنے کمالات اور توحید پر دلائل قائم کرنے والا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچّے خُدا کا ماننے والا کسی مجلس میں شرمندہ نہیں ہوسکتا۔ اور نہ خُدا کے سامنے شرمندہ ہوگا کیونکہ اس کے پاس زبردست دلائل ہوتے ہیں لیکن بناوٹی خُدا کا ماننے والا بڑی مصیبت میں ہوتا ہے۔ وُہ بجائے دلائل بیان کرنے کے ہر ایک بیہودہ بات کو راز میں داخل کرتا ہے تا ہنسی نہ ہو اور ثابت شُدہ غلطیوں کو چُھپانا چاہتا ہے۔

اور پھر فرمایا کہ اَلْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ یعنی وُہ سب کا محافظ ہے اور سب پر غالب اور بگڑے ہُوئے کا بنانے والا ہے۔ اور اس کی ذات نہایت ہی مستغنی ہے۔ اور فرمایا ھُوَاللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی یعنی وُہ ایسا خُدا ہے کہ جسموں کا پیدا کرنے والا اور رُوحوں کا بھی پیدا کرنے والا۔ رحم میں تصویر کھینچنے والا ہے۔ تمام نیک نام جہاں تک خیال میں آسکیں سب اسی کے نام ہیں۔ اور پھر فرمایا یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ یعنی آسمان کے لوگ بھی اُس کے نام کو پاکی سے یاد کرتے ہیں اور زمین کے لوگ بھی۔ اِس آیت میں اشارہ فرمایا کہ آسمانی اجرام میں آبادی ہے اور وُہ لوگ بھی پابند خُدا کی ہدایتوں کے ہیں۔ اور پھر فرمایا عَلٰی کُلِّ

شَیْءٍ قَدِیْرٌ" یعنی خُدا بڑا قادر ہے۔ یہ پرستاروں کے لئے تسلّی ہے۔ کیونکہ اگر خُدا عاجز ہو اور قادر نہ ہو تو ایسے خُدا سے کیا امید رکھیں۔ اور پھر فرمایا:۔ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔

یعنی وُہی خُدا ہے جو تمام عالموں کا پرورش کرنے والا رحمٰن رحیم اور جزاء کے دِن کا آپ مالک ہے۔ اِس اختیار کو کسی کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ ہر ایک پکارنے والے کی پُکار کو سُننے والا اور جواب دینے والا یعنی دُعاؤں کا قبول کرنے والا۔ اور پھر فرمایا اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یعنی ہمیشہ رہنے والا اور تمام جانوں کی جان اور سب کے وجُود کا سہارا۔ یہ اِس لیئے کہا کہ وُہ ازلی ابدی نہ ہو تو اس زندگی کے بارے میں بھی دھڑکا رہیگا کہ شاید ہم سے پہلے فوت نہ ہو جائے۔ اور پھر فرمایا کہ وُہ خُدا اکیلا خُدا ہے۔ نہ وُہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اُس کا بیٹا اور نہ کوئی اس کے برابر اور نہ کوئی اُس کا ہم جنس ۔

اور یاد رہے کہ خُدائے تعالیٰ کی توحید کو صحیح طور پر ماننا اور اس میں زیادت یا کمی نہ کرنا۔ یہ وُہ عدل ہے جو انسان اپنے مالک حقیقی کے حق میں بجا لاتا ہے۔ یہ تمام حصّہ اخلاقی تعلیم کا ہے جو قرآن شریف کی تعلیم میں سے درج ہُوا۔ اس میں اصُول یہ ہے کہ خُدائے تعالیٰ نے تمام اخلاق کو افراط اور تفریط سے بچایا ہے۔ اور ہر ایک خُلق کو اُس حالت میں خُلق کے نام سے موسُوم کیا ہے کہ جب اپنی واقعی اور واجب حد سے کم و بیش نہ ہو۔ یہ تو

ظاہر ہے کہ حقیقی نیکی وُہی چیز ہے جو دو حدّوں کے وسط میں ہوتی ہے یعنی زیادتی اور کمی یا افراط اور تفریط کے درمیان ہوتی ہے۔ ہر ایک عادت جو وسط کی طرف کھینچے اور وسط پر قائم کرے وُہی خلق فاضل کو پیدا کرتی ہے محل اور موقع کا پہچاننا ایک وسط ہے۔ مثلاً اگر زمیندار اپنا تخم وقت سے پہلے بودے یا وقت کے بعد۔ دونوں صُورتوں میں وُہ وسط کو چھوڑتا ہے۔ نیکی اور حق اور حکمت سب وسط میں ہے اور وسط موقع بینی ہیں۔ یا یُوں سمجھ لو کہ حق وُہ چیز ہے کہ ہمیشہ دو متقابل باطلوں کے وسط میں ہوتا ہے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ عین موقع کا التزام ہمیشہ انسان کو وسط میں رکھتا ہے۔ اور خدا شناسی کے بارے میں وسط کی شناخت یہ ہے کہ خُدا کی صفات بیان کرنے میں نہ تو نفی صفات کے پہلو کی طرف جُھک جائے اور نہ خُدا کو جسمانی چیزوں کا مشابہ قرار دے۔ یہی طریق قرآن شریف نے صفاتِ باری تعالیٰ میں اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وُہ یہ بھی فرماتا ہے کہ خدا دیکھتا، سُنتا، جانتا، بولتا، کلام کرتا ہے۔ اور پھر مخلوق کی مُشابہت سے بچانے کے لئے یہ بھی فرماتا ہے:۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ [1] فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ [2]

یعنی خُدا کی ذات اور صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس کے لئے مخلوق سے مثالیں مت دو۔ سو خُدا کی ذات کو تشبیہ اور تنزیہ کے بَین بَین رکھنا یہی وسط ہے۔ غرض **اسلام** کی تعلیم تمام میانہ روی کی

---

[1] ۴۲ : ۱۲ ، [2] ۱۶ : ۷۵

تعلیم ہے۔ سُورۂ فاتحہ بھی میانہ روی کی ہدایت فرماتی ہے۔ کیونکہ خُدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۞ مغضوب علیہم سے وہ لوگ مُراد ہیں جو خُدائے تعالیٰ کے مقابل پر قوتِ غضبی کو استعمال کر کے قویٰ سبعیہ کی پیروی کرتے ہیں۔ اور ضآلّین سے وہ مُراد ہیں جو قویٰ بہیمیہ کی پیروی کرتے ہیں۔ اور میانہ طریق وُہ ہے جس کو لفظ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے یاد فرمایا ہے۔ غرض اس مُبارک اُمّت کے لئے قرآن شریف میں وسط کی ہدایت ہے۔ توریت میں خُدائے تعالیٰ نے انتقامی امُور پر زور دیا تھا۔ اور انجیل میں عفو و درگذر پر زور دیا تھا۔ اور اس اُمّت کو موقع شناسی اور وسط کی تعلیم ملی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔[1]

یعنی ہم نے تم کو وسط پر عمل کرنے والے بنایا اور وسط کی تعلیم تمھیں دی۔ سو مُبارک وُہ جو وسط پر چلتے ہیں۔ خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا۔

رُوحانی حالتیں

تیسرا سوال یعنی یہ کہ "رُوحانی حالتیں کیا ہیں"؟ واضح رہے کہ ہم پہلے اِس سے بیان کر چکے ہیں کہ بموجب ہدایت قرآن شریف کے رُوحانی حالتوں کا منبع اور سر چشمہ نفسِ مطمئنّہ ہے جو انسان کو با اخلاق ہونے کے مرتبہ سے باخُدا ہونے کے مرتبہ تک پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے:۔

---

[1] ۲: ۱۴۴۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۚ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ؎

یعنی اَے نفس خُدا کے ساتھ آرام یافتہ۔ اپنے ربّ کی طرف واپس چلا آ۔ وُہ تجھ سے راضی اور تُو اُس سے راضی۔ پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری بہشت کے اندر آجا ؀

اِس جگہ بہتر ہے کہ ہم رُوحانی حالتوں کے بیان کرنے کے لئے اِس آیتِ کریمہ کی تفسیر کسی قدر توضیح سے بیان کریں۔ پس یاد رکھنا چاہیئے کہ اعلیٰ درجہ کی رُوحانی حالت انسان کی اِس دُنیوی زندگی میں یہ ہے کہ خُدا تعالیٰ کے ساتھ آرام پاجائے۔ اور تمام اطمینان اور سرُور اور لذّت اس کی خُدا میں ہی ہو جائے۔ یہی وُہ حالت ہے جس کو دُوسرے لفظوں میں بہشتی زِندگی کہا جاتا ہے۔ اِس حالت میں انسان اپنے کامل صِدق اور صفا اور وفا کے بدلہ میں ایک نقد بہشت پالیتا ہے۔ اور دُوسرے لوگوں کی بہشتِ مَوعُود پر نظر ہوتی ہے۔ اور یہ بہشتِ موجود میں داخل ہوتا ہے۔ اسی درجہ پر پہنچ کر انسان سمجھتا ہے کہ وُہ عبادت جس کا بوجھ اُس کے سر پر ڈالا گیا ہے درحقیقت وُہی ایک ایسی غذا ہے جس سے اس کی رُوح نشو و نما پاتی ہے اور جس پر اس کی رُوحانی زندگی کا بڑا بھاری مدار ہے۔ اور اس کے نتیجہ کا حصُول کسی دُوسرے جہان پر موقوف نہیں ہے۔ اسی مقام پر یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ وہ ساری ملامتیں جو نفسِ لوّامہ انسان کا اسکی ناپاک

؎ ۸۹ : ۲۸ - ۳۱ ،

زندگی پر کرتا ہے۔ اور پھر بھی نیک خواہشوں کو اچھی طرح اُبھار نہیں سکتا۔ اور بُری خواہشوں سے حقیقی نفرت نہیں دِلا سکتا۔ اور نہ نیکی پر ٹھہرنے کی پُوری قوّت بخش سکتا ہے اِس پاک تحرِیک سے بدل جاتی ہیں جو نفسِ مطمئنّہ کے نشوونما کا آغاز ہوتی ہے۔ اور اس درجہ پر پہنچ کر وقت آجاتا ہے کہ انسان پوری فلاح حاصل کرے۔ اور اب تمام نفسانی جذبات خود بخود افسُردہ ہونے لگتے ہیں۔ اور رُوح پر ایک ایسی طاقت افزا ہوَا چلنے لگتی ہے جس سے انسان پہلی کمزوریوں کو ندامت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس وقت انسانی سرِشت پر ایک بھاری انقلاب آتا ہے اور عادت میں ایک تبدّلِ عظیم پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان اپنی پہلی حالتوں سے بُہت ہی دُور جا پڑتا ہے۔ دھویا جاتا ہے اور صاف کیا جاتا ہے اور خُدا کی نیکی کی محبّت کو اپنے ہاتھ سے اس کے دِل میں لکھ دیتا ہے۔ اور بدی کا گند اپنے ہاتھ سے اُس کے دِل سے باہر پھینک دیتا ہے۔ سچّائی کی فوج سب کی سب دِل کے شہرستان میں آجاتی ہے۔ اور فِطرت کے تمام بُرجوں پر راست بازی کا قبضہ ہو جاتا ہے اور حق کی فتح ہوتی ہے۔ اور باطل بھاگ جاتا ہے اور اپنے ہتھیار پھینک دیتا ہے۔ اس شخص کے دِل پر خُدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اور ہر ایک قدم خُدا کے زیرِ سایہ چلتا ہے۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ آیاتِ ذیل میں اِنہی اُمور کی طرف اشارہ فرماتا ہے:۔

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ۔ ؎

؎ ۵۸ : ۲۳ ،

وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ۔ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً وَّاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ[1] جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا[2]

یعنی خُدا نے مومنوں کے دِل میں ایمان کو اپنے ہاتھ سے لکھ دِیا ہے۔ اور رُوح القدس کے ساتھ اُن کی مدد کی۔ اُس نے اے مومنو! ایمان کو تمہارا محبُوب بنا دِیا۔ اور اس کا حُسن و جمال تمہارے دِل میں بٹھا دیا۔ اور کُفر اور بدکاری اور معصیت سے تمہارے دِل کو نفرت دے دی۔ اور بُری راہوں کا مکرُوہ ہونا تمہارے دِل میں جما دِیا۔ یہ سب کچھ خُدا کے فضل اور رحمت سے ہُوا۔ حق آیا اور باطل بھاگ گیا۔ اور باطل کب حق کے مقابل ٹھہر سکتا تھا۔

غرض یہ تمام اشارات اس رُوحانی حالت کی طرف ہیں جو تیسرے درجہ پر انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اور سچّی بینائی اِنسان کو کبھی نہیں مل سکتی جب تک یہ حالت اس کو حاصل نہ ہو۔ اور یہ جو خُدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں نے ایمان اُن کے دِل میں اپنے ہاتھ سے لکھا۔ اور رُوح القُدس سے اُن کی مدد کی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو سچّی طہارت اور پاکیزگی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک آسمانی مدد اُس کے شاملِ حال نہ ہو۔ نفسِ لوّامہ کے مرتبہ پر انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ بار بار توبہ کرتا اور

---

[1] ۴۹: ۸، ۹؛ [2] ۱۷: ۸۲؛

بار بار گِرتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات اپنی صلاحیت سے نا اُمید ہو جاتا ہے اور اپنے مرض کو ناقابلِ علاج سمجھ لیتا ہے۔ اور ایک مُدت تک ایسا ہی رہتا ہے۔ اور پھر جب وقت مقدّر پُورا ہو جاتا ہے تو رات یا دِن کو یک دفعہ ایک نُور اس پر نازل ہوتا ہے اور اس نُور میں الٰہی قوّت ہوتی ہے۔ اس نور کے نازل ہونے کے ساتھ ہی ایک عجیب تبدیلی اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور غیبی ہاتھ کا ایک قوی تصرّف محسوس ہوتا ہے۔ اور ایک عجیب عالم سامنے آجاتا ہے۔ اس وقت انسان کو پتہ لگتا ہے کہ خُدا ہے۔ اور آنکھوں میں وُہ نور آجاتا ہے جو پہلے نہیں تھا۔ لیکن اس راہ کو کیونکر حاصل کریں اور اس روشنی کو کیونکر پاویں۔ سو جاننا چاہئیے کہ اِس دُنیا میں جو دار الاسباب ہے ہر ایک معلول کے لئے ایک عِلّت ہے۔ اور ہر ایک حرکت کے لئے ایک محرّک ہے۔ اور ہر ایک علم حاصل کرنے کے لئے ایک راہ ہے جس کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ دُنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو بغیر پابندی ان قواعد کے مِل سکے جو قدرت نے ابتدا سے اس کے لئے مقرّر کر رکھے ہیں۔ قانونِ قدرت بتلا رہا ہے کہ ہر ایک چیز کے حصُول کیلئے ایک صراطِ مستقیم ہے اور اس کا حصُول اسی پر قدرتًا موقوف ہے۔ مثلاً اگر ہم ایک اندھیری کوٹھڑی میں بیٹھے ہوں۔ اور آفتاب کی روشنی کی ضرورت ہو تو ہمارے لئے یہ صراطِ مستقیم ہے کہ ہم اس کھڑکی کو کھول دیں جو آفتاب کی طرف ہے۔ تب یک دفعہ آفتاب کی روشنی اندر آکر ہمیں منوّر کر دے گی۔ سو ظاہر ہے کہ اِسی طرح خُدا کے سچّے اور واقعی فیوض پانے کے لئے بھی

کوئی کھڑکی ہوگی اور پاک رُوحانیت کے حاصل کرنے کے لئے کوئی خاص طریق ہوگا۔ اور وُہ یہ ہے کہ رُوحانی امُور کے لئے صراطِ مستقیم کی تلاش کریں جیسا کہ ہم اپنی زندگی کے تمام امُور میں اپنی کامیابیوں کے لئے صراطِ مستقیم کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ مگر کیا وُہ یہ طریق ہے کہ ہم صرف اپنی ہی عقل کے زور سے اور اپنی ہی خود تراشیدہ باتوں سے خُدا کے وصال کو ڈھونڈیں۔ کیا محض ہماری ہی اپنی منطق اور فلسفہ سے اس کے وُہ دروازے ہم پر کھُلتے ہیں جن کا کھُلنا اس کے قوی ہاتھ پر موقوف ہے۔ یقیناً سمجھو کہ یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔ ہم اس حیّ وقیّوم کو محض اپنی ہی تدبیروں سے ہرگز نہیں پاسکتے بلکہ اس راہ میں صراطِ مستقیم صرف یہ ہے کہ پہلے ہم اپنی زندگی مع اپنی تمام قوّتوں کے خُدائے تعالیٰ کی راہ میں وقف کرکے پھر خُدا کے وصال کے لئے دُعا میں لگے رہیں۔ تا خُدا کو خُدا ہی کے ذریعہ سے پاویں ؂

ایک پیاری دُعا

اور سب سے پیاری دُعا جو عین محل اور موقع سوال کا ہمیں سکھاتی ہے اور فطرت کے رُوحانی جوش کا نقشہ ہمارے سامنے رکھتی ہے۔ وہ دُعا ہے جو خُدائے کریم نے اپنی پاک کتاب قرآنِ شریف میں یعنی سورۂ فاتحہ میں ہمیں سکھائی ہے۔ اور وُہ یہ ہے:۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ تمام پاک تعریفیں جو ہو سکتی ہیں اُس اللہ کیلئے ہیں جو تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔ اَلرَّحۡمٰنِ

الرَّحِيْمِ وُہی خدا جو ہمارے اعمال سے پہلے ہمارے لئے رحمت کا سامان میسّر کرنے والا ہے اور ہمارے اعمال کے بعد رحمت کے ساتھ جزا دینے والا ہے ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ وُہ خدا جو جزاء کے دن کا وُہی ایک مالک ہے کسی اَور کو وُہ دِن نہیں سونپا گیا اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اَے وُہ جو اِن تعرِیفوں کا جامع ہے ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور ہم ہر ایک کام میں توفیق تجھ ہی سے چاہتے ہیں ۔ اِس جگہ ہم کے لفظ سے پرستش کا اقرار کرنا اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہمارے تمام قویٰ تیری پرستش میں لگے ہُوئے ہیں اور تیرے آستانہ پر جُھکے ہُوئے ہیں کیونکہ انسان باعتبار اپنے اندرُونی قویٰ کے ایک جماعت اور ایک اُمّت ہے اور اِس طرح پر تمام قویٰ کا خُدا کو سجدہ کرنا یہی وُہ حالت ہے جس کو اسلام کہتے ہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ ہمیں اپنی رسیدھی راہ دِکھلا اور اُس پر ثابت قدم کر کے اُن لوگوں کی راہ دِکھلا جن پر تیرا انعام واکرام ہے اور تیرے مورِدِ فضل وکرم ہو گئے ہیں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ اور ہمیں اُن لوگوں کی راہوں سے بچا جن پر تیرا غضب ہے اور جو تجھ تک نہیں پہنچ سکے اور راہ کو بھُول گئے ۔ آمین ۔ اَے خُدا ایسا ہی کر ۔

یہ آیات سمجھا رہی ہیں کہ خُدائے تعالیٰ کے انعامات جو دُوسرے لفظوں میں فیوض کہلاتے ہیں انہی پر نازل ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کی خُدا کی راہ میں قربانی دے کر اور اپنا تمام وجُود اُس کی راہ میں وقف کر کے اور

اُس کی رضا میں محو ہو کر پھر اِس وجہ سے دُعا میں لگے رہتے ہیں کہ تا جو کچھ انسان کو رُوحانی نعمتوں اور خُدا کے قُرب اور وصال اور اسکے مکالمات اور مخاطبات میں سے مل سکتا ہے وُہ سب اُن کو ملے۔ اور اِس دُعا کے ساتھ اپنے تمام قویٰ سے عبادت بجا لاتے ہیں اور گُناہ سے پرہیز کرتے ہیں اور آستانۂ الٰہی پر پڑے رہتے ہیں اور جہاں تک اُن کے لئے ممکن ہے اپنے تئیں بدی سے بچاتے ہیں اور غضبِ الٰہی کی راہوں سے دُور رہتے ہیں۔ سو چونکہ وُہ ایک اعلیٰ ہمّت اور صِدق کے ساتھ خُدا کو ڈھُونڈتے ہیں اِس لئے اس کو پا لیتے ہیں اور خُدائے تعالیٰ کی پاک معرفت کے پیالوں سے سیراب کئے جاتے ہیں۔ اِس آیت میں جو استقامت کا ذکر فرمایا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچّا اور کامل فیض جو رُوحانی عالم تک پہنچاتا ہے کامل استقامت سے وابستہ ہے اور کامل استقامت سے مُراد ایک ایسی حالتِ صِدق و وفا ہے جس کو کوئی امتحان ضرر نہ پہنچا سکے۔ یعنی ایسا پیوند ہو جس کو نہ تلوار کاٹ سکے نہ آگ جلا سکے۔ اور نہ کوئی دُوسری آفت نقصان پہنچا سکے۔ عزیزوں کی موتیں اس سے علیحدہ نہ کر سکیں۔ پیاروں کی جُدائی اس میں خلل انداز نہ ہو سکے بے آبروئی کا خوف کچھ رُعب نہ ڈال سکے۔ ہولناک دُکھوں سے مارا جانا ایک ذرّہ دِل کو نہ ڈرا سکے۔ سو یہ دروازہ نہایت تنگ ہے اور یہ راہ نہایت دُشوار گُذار ہے۔ کس قدر مشکل ہے۔ آہ! صد آہ!!

اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اِن آیات میں اشارہ فرماتا ہے:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۣاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ؀

یعنی اُن کو کہہ دے کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری عورتیں اور تمھاری برادری اور تمھارے وُہ مال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور تمھاری سوداگری جس کے بند ہونے کا تمھیں خوف ہے۔ اور تمھاری حویلیاں جو تمھارے دِل پسند ہیں خدا سے اور اُس کے رسُول سے اور خدا کی راہ میں اپنی جانوں کو لڑانے سے زیادہ پیارے ہیں تو تُم اس وقت تک منتظر رہو کہ جب تک خُدا اپنا حُکم ظاہر کرے اور خُدا بدکاروں کو کبھی اپنی راہ نہیں دِکھائے گا۔

اِن آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ خُدا کی مرضی کو چھوڑ کر اپنے عزیزوں اور مالوں سے پیار کرتے ہیں وُہ خُدا کی نظر میں بدکار ہیں۔ وُہ ضرور ہلاک ہوں گے۔ کیونکہ اُنھوں نے غیر کو خُدا پر مقدّم رکھا۔ یہی وُہ تیسرا مرتبہ ہے جس میں وُہ شخص باخُدا بنتا ہے۔ جو اُس کے لئے ہزاروں بلائیں خرید لے اور خُدا کی طرف ایسے صدق اور اخلاص سے جھک جائے

لہ ۹: ۲۵،

کہ خُدا کے سوا کوئی اس کا نہ رہے گویا سب مر گئے۔ پس سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہم خود نہ مریں زندہ خدا نظر نہیں آسکتا۔ خُدا کے ظہُور کا وُہی دِن ہوتا ہے کہ جب ہماری جسمانی زِندگی پر موت آوے۔ ہم اندھے ہیں جب تک غیر کے دیکھنے سے اندھے نہ ہو جائیں۔ ہم مُردہ ہیں جب تک خدا کے ہاتھ میں مُردہ کی طرح نہ ہو جائیں۔ جب ہمارا مُنہ ٹھیک ٹھیک اسکے محاذات میں پڑے گا۔ تب وُہ واقعی استقامت جو تمام نفسانی جذبات پر غالب آتی ہے ہمیں حاصل ہو گی۔ اس سے پہلے نہیں اور یہی وُہ استقامت ہے جس سے نفسانی زِندگی پر موت آجاتی ہے ﴿

ہماری استقامت یہ ہے کہ جیسا کہ وُہ فرماتا ہے کہ:۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ [1]

یعنی یہ کہ قربانی کی طرح میرے آگے گردن رکھ دو۔ ایسا ہی ہم اس وقت درجۂ استقامت حاصل کریں گے کہ جب ہمارے وجُود کے تمام پُرزے اور ہمارے نفس کی تمام قُوتیں اسی کام میں لگ جائیں اور ہماری موت اور ہماری زِندگی اسی کے لئے ہو جائے۔ جیسا کہ وُہ فرماتا ہے:۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ [2]

یعنی کہہ میری نماز اور میری قُربانی اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا سب خُدا کے لئے ہے۔ اور جب انسان کی محبّت خُدا کے ساتھ اس درجہ تک

---

[1] ۲ : ۱۱۳، [2] ۶ : ۱۶۴،

پہنچ جائے کہ اس کا مرنا اور جینا اپنے لئے نہیں بلکہ خُدا ہی کیلئے ہو جائے۔
تب خُدا جو ہمیشہ سے پیار کرنے والوں کے ساتھ پیار کرتا آیا ہے اپنی محبت
کو اس پر اُتارتا ہے۔ اور ان دونوں محبّتوں کے ملنے سے اِنسان کے
اندر ایک نُور پیدا ہوتا ہے جس کو دُنیا نہیں پہچانتی اور نہ سمجھ سکتی ہے۔
اور ہزاروں صدّیقوں اور برگزیدوں کا اِسی لئے خون ہُوا کہ دُنیا نے اُن کو
نہیں پہچانا۔ وُہ اِسی لئے مکّار اور خود غرض کہلائے کہ دُنیا اُن کے نُورانی
چہرہ کو دیکھ نہ سکی۔ جیسا کہ فرماتا ہے :۔

يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

یعنی وُہ جو مُنکر ہیں تیری طرف دیکھتے تو ہیں مگر تو اُنہیں نظر نہیں آتا۔
غرض جب وُہ نُور پیدا ہوتا ہے تو اُس نور کی پیدائش کے دِن سے
ایک زمینی شخص آسمانی ہو جاتا ہے۔ وُہ جو ہر ایک وجُود کا مالک ہے اس
کے اندر بولتا ہے۔ اور اپنی الُوہیت کی چمکیں دِکھلاتا ہے۔ اور اس کے
دِل کو جو پاک محبّت سے بھرا ہُوا ہے اپنا تخت گاہ بناتا ہے اور جب ہی
سے کہ یہ شخص ایک نُورانی تبدیلی پا کر ایک نیا آدمی ہو جاتا ہے۔ وُہ اس
کے لئے ایک نیا خدا ہو جاتا ہے اور نئی عادتیں اور سُنّتیں ظہُور میں لاتا
ہے۔ یہ نہیں کہ وُہ نیا خُدا ہے یا عادتیں نئی ہیں۔ مگر خُدا کی عام عادتوں
سے وُہ الگ عادتیں ہوتی ہیں جو دُنیا کا فلسفہ اُن سے آشنا نہیں ٭
اور یہ شخص جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ نے فرمایا ہے :۔

ط ۷ : ۱۹۰ ،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ
وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۝

یعنی انسانوں میں سے وُہ اعلیٰ درجہ کے اِنسان ہیں جو خُدا کی رضا میں کھوئے جاتے ہیں۔ وُہ اپنی جان بیچتے ہیں اور خُدا کی مرضی کو مول لیتے ہیں۔ یہی وُہ لوگ ہیں جِن پر خُدا کی رحمت ہے۔ ایسا ہی وُہ شخص جو رُوحانی حالت کے مرتبہ تک پہنچ گیا ہو خُدا کی راہ میں فدا ہو جاتا ہے ٭

خُدائے تعالےٰ اِس آیت میں فرماتا ہے کہ تمام دُکھوں سے وُہ شخص نجات پاتا ہے جو میری راہ میں اور میری رضا کی راہ میں جان کو بیچ دیتا ہے اور جاں فشانی کے ساتھ اپنی اس حالت کا ثبوت دیتا ہے کہ وُہ خُدا کا ہے۔ اور اپنے تمام وجود کو ایک ایسی چیز سمجھتا ہے جو طاعت خالق اور خدمتِ مخلُوق کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور پھر حقیقی نیکیاں جو ہر ایک قوّت سے متعلّق ہیں ایسے ذوق و شوق و حضورِ دِل سے بجالاتا ہے کہ گویا وُہ اپنی فرماں برداری کے آئینہ میں اپنے محبُوبِ حقیقی کو دیکھ رہا ہے اور ارادہ اس کا خدائے تعالیٰ کے ارادہ سے ہم رنگ ہو جاتا ہے۔ اور تمام لذّت اس کی فرماں برداری میں ٹھہر جاتی ہے اور تمام اعمالِ صالحہ نہ مشقّت کی راہ سے بلکہ تلذّذ اور احظاظ کی کشش سے ظاہر ہونے لگتے ہیں وُہ نقد بہشت ہے جو رُوحانی انسان کو مِلتا ہے۔ اور وُہ بہشت جو آئندہ ملے گا وُہ درحقیقت اسی کی اظلال و آثار ہے جس کو دُوسرے عالم

---

۲ : ۲۰۸ ؎

میں قدرتِ خداوندی جسمانی طور پر متمثل کر کے دکھلائے گی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے:۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ[۱] وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا[۲] اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا[۳] يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا[۴] اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا[۵] وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا[۶]

یعنی وہ شخص جو خدائے تعالیٰ سے خائف ہے اور اس کی عظمت و جلال کے مرتبہ سے ہراساں ہے اس کے لئے دو بہشت ہیں۔ ایک یہی دنیا اور دوسری آخرت۔ اور ایسے لوگ جو خدا میں محو ہیں خدا نے اُن کو وُہ شربت پلایا ہے جس نے اُن کے دل اور خیالات اور ارادات کو پاک کر دیا۔ نیک بندے وُہ شربت پی رہے ہیں جس کی ملونی کافور ہے۔ وہ اُس چشمہ سے پیتے ہیں جس کو وُہ آپ ہی چیرتے ہیں۔

---

[۱] ۵۵ : ۴۷ ، [۲] ۷۶ : ۲۲ ، [۳] ۷۶ : ۶-۷ ، [۴] ۷۶ : ۱۸-۱۹ ،
[۵] ۷۶ : ۵ ، [۶] ۱۷ : ۷۳ ،

کافوری اور زنجبیلی شربت کی حقیقت

اور مَیں پہلے بھی بیان کرچکا ہوں کہ کافُور کا لفظ اِس واسطے اِس آیت میں اختیار فرمایا گیا ہے کہ لُغتِ عرب میں کَفَرَ دبانے کو اور ڈھانکنے کو کہتے ہیں۔ سو یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اُنھوں نے ایسے خلُوص سے انقطاع اور رجُوع اِلی اللہ کا پیالہ پیا ہے کہ دُنیا کی محبّت بالکل ٹھنڈی ہوگئی ہے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ تمام جذبات دِل کے خیال سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب دِل نالائق خیالات سے بُہت ہی دُور چلا جائے اور کُچھ تعلّقات اُن سے باقی نہ رہیں تو وُہ جذبات بھی آہستہ آہستہ کم ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ نابُود ہو جاتے ہیں۔ سو اس جگہ خُدا تعالیٰ کی یہی غرض ہے۔ اور وُہ اس آیت میں یہی سمجھاتا ہے کہ جو اس کی طرف کامل طور سے جُھک گئے وُہ نفسانی جذبات سے بہُت ہی دُور نکل گئے۔ اور ایسے خُدا کی طرف جُھک گئے کہ دُنیا کی سرگرمیوں سے اُن کے دِل ٹھنڈے ہوگئے۔ اور اُن کے جذبات ایسے دَب گئے جیسا کہ کافُور زہریلے مادوں کو دبا دیتا ہے ۔

اور پھر فرمایا کہ وُہ لوگ اس کافوری پیالہ کے بعد وُہ پیالے پیتے ہیں جن کی ملونی زنجبیل ہے۔ اب جاننا چاہیئے کہ زنجبیل دو۲ لفظوں سے مرکّب ہے۔ یعنی زنا اور جبل سے۔ زنا لُغتِ عرب میں اُوپر چڑھنے

کو کہتے ہیں اور جبلؔ پہاڑ کو۔ اس کے ترکیبی معنی یہ ہیں کہ پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اب جاننا چاہیئے کہ انسان پر ایک زہریلی بیماری کے فرو ہونے کے بعد اعلیٰ درجہ کی صحت تک دو حالتیں آتی ہیں۔ ایک وُہ حالت جب کہ زہریلے مواد کا جوش بکُلّی جاتا رہتا ہے اور خطرناک مادوں کا جوش رُو بہ اصلاح ہو جاتا ہے اور سمّی کیفیات کا حملہ بخیر و عافیت گذر جاتا ہے۔ اور ایک مُہلک طُوفان جو اُٹھا تھا نیچے دب جاتا ہے۔ لیکن ہنُوز اعضاء میں کمزوری باقی ہوتی ہے۔ کوئی طاقت کا کام نہیں ہو سکتا۔ ابھی مُردوں کی طرح افتاں و خیزاں چلتا ہے۔ اور دُوسری وُہ حالت ہے کہ جب اصل صحّت عود کر آتی اور بدن میں طاقت بھر جاتی ہے۔ اور قُوّت کے بحال ہونے سے یہ حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بلا تکلّف پہاڑ کے اُوپر چڑھ جائے اور نشاطِ خاطر سے اونچی گھاٹیوں پر دَوڑتا چلا جائے۔ سو سلوک کے تیسرے مرتبہ میں یہ طاقت میسّر آتی ہے۔ ایسی حالت کی نسبت اللہ تعالیٰ آیتِ موصوفہ میں اشارہ فرماتا ہے کہ انتہائی درجہ کے باخُدا لوگ وُہ پیالے پیتے ہیں جن میں زنجبیل ملی ہوئی ہے۔ یعنی وہ رُوحانی حالت کی پُوری قُوّت پاکر بڑی بڑی گھاٹیوں پر چڑھ جاتے ہیں اور بڑے مشکل کام اُن کے ہاتھ سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔ اور خُدا تعالےٰ کی راہ میں حیرت ناک جاں فشانیاں دِکھلاتے ہیں ۞

زنجبیل کی تاثیر

اس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ علمِ طب کی رُو سے زنجبیل وُہ دوا ہے جس کو ہندی میں سُونٹھ کہتے ہیں۔ وُہ حرارتِ غریزی کو بہت قُوّت دیتی ہے اور دستوں کو بند کرتی ہے۔ اور اس کا زنجبیل اسی واسطے نام رکھا گیا ہے کہ گویا وُہ کمزور کو ایسا قوی کرتی ہے اور ایسی گرمی پہنچاتی ہے جس سے وُہ پہاڑوں پر چڑھ سکے۔ ان متقابل آیتوں کے پیش کرنے سے جن میں ایک جگہ کافُور کا ذکر ہے اور ایک جگہ زنجبیل کا۔ خُدائے تعالیٰ کی غرض یہ ہے کہ تا اپنے بندوں کو سمجھائے کہ جب انسان جذباتِ نفسانی سے نیکی کی طرف حرکت کرتا ہے تو پہلے پہل اِس حرکت کے بعد یہ حالت پیدا ہوتی ہے کہ اس کے زہریلے مواد نیچے دبائے جاتے ہیں۔ اور نفسانی جذبات رُوبکمی ہونے لگتے ہیں۔ جیسا کہ کافُور زہریلے مواد کو دبا لیتا ہے۔ اِسی لئے وُہ ہیضہ اور مُحرقہ تپوں میں مُفید ہے۔ اور پھر جب زہریلے مواد کا جوش بالکل جاتا رہے۔ اور ایک کمزور صحّت جو ضُعف کے ساتھ ملی ہُوئی ہوتی ہے حاصل ہو جائے تو پھر دُوسرا مرحلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف بیمار زنجبیل کے شربت سے قُوّت پاتا ہے۔ اور زنجبیلی شربت خُدائے تعالےٰ کے حُسن و جمال کی تجلّی ہے جو رُوح کی غذا ہے۔ جب اِس تجلّی سے اِنسان قُوّت پکڑتا ہے تو پھر بلند اور اُونچی گھاٹیوں پر چڑھنے کے لائق ہو جاتا ہے اور خُدائے تعالیٰ کی راہ میں ایسی حیرت ناک سختی کے کام دِکھلاتا ہے

کہ جب تک یہ عاشقانہ گرمی کسی کے دِل میں نہ ہو ہرگز ایسے کام دِکھلا نہیں سکتا۔ سو خدائے تعالےٰ نے اس جگہ ان دونوں حالتوں کے سمجھانے کیلئے عربی زبان کے دو لفظوں سے کام لیا ہے۔ ایک کافور سے جو نیچے دبانے والے کو کہتے ہیں اور دُوسرے زنجبیل سے جو اُوپر چڑھنے والے کو کہتے ہیں اور اس راہ میں بھی دو حالتیں سالکوں کے لئے واقع ہیں ؎

باقی حصّہ آیت کا یہ ہے اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝ یعنی ہم نے مُنکروں کے لئے جو سچائی کو قبُول کرنا نہیں چاہتے زنجیریں تیار کر دی ہیں اور طوقِ گردن اور ایک افروختہ آگ کی سوزش۔ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ سچّے دِل سے خُدائے تعالیٰ کو نہیں ڈھونڈتے اُن پر خُدا کی طرف سے رجعت پڑتی ہے۔ وُہ دُنیا کی گرفتاریوں میں اَیسے مُبتلا رہتے ہیں کہ گویا پا بزنجیر ہیں اور زمینی کاموں میں اَیسے نگونسار ہوتے ہیں کہ گویا اُن کی گردن میں ایک طوق ہے جو اُن کو آسمان کی طرف سر نہیں اُٹھانے دیتا اور اُن کے دِلوں میں حرص و ہَوا کی ایک سوزش لگی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ مال حاصل ہو جائے۔ اور یہ جائداد مِل جائے اور فلاں مُلک ہمارے قبضہ میں آجائے۔ اور فلاں دُشمن پر ہم فتح پائیں۔ اِس قدر رُوپیہ ہو، اِتنی دولت ہو، سو چونکہ خُدائے تعالےٰ اُن کو نالائق دیکھتا ہے اور بُرے کاموں میں مشغول پاتا ہے اِس لئے یہ تینوں بلائیں اُن کو لگا دیتا ہے۔ اور اس جگہ اِس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب انسان سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے

تو اسی کے مُطابق خدا تعالیٰ بھی اپنی طرف سے ایک فعل صادر کرتا ہے۔ مثلاً انسان جس وقت اپنی کوٹھڑی کے تمام دروازوں کو بند کردے تو انسان کے اِس فعل کے بعد خُدائے تعالیٰ کا یہ فعل ہوگا کہ وُہ اس کوٹھڑی میں اندھیرا پیدا کردے گا۔ کیونکہ جو امور خدائے تعالیٰ کے قانونِ قُدرت میں ہمارے کاموں کے لئے بطور ایک نتیجہ لازمی کے مقدّر ہو چکے ہیں وُہ سب خُدا تعالیٰ کے فعل ہیں۔ وجہ یہ کہ وُہی علّتِ علل ہے۔ ایسا ہی اگر مثلاً کوئی شخص زہرِ قاتل کھالے تو اُس کے اِس فعل کے بعد خُدائے تعالیٰ کا یہ فعل صادر ہوگا کہ اسے ہلاک کردے گا۔ ایسا ہی اگر کوئی ایسا بے جا فعل کرے جو کسی متعدّی بیماری کا موجب ہو تو اس کے اس فعل کے بعد خُدائے تعالیٰ کا یہ فعل ہوگا کہ وُہ متعدّی بیماری اس کو پکڑلے گی۔ پس جس طرح ہماری دُنیوی زندگی میں صریح نظر آتا ہے کہ ہمارے ہر ایک فعل کے لئے ایک ضروری نتیجہ ہے اور وُہ نتیجہ خُدائے تعالےٰ کا فعل ہے۔ ایسا ہی دِین کے متعلّق بھی یہی قانون ہے۔ جیسا کہ خُدائے تعالیٰ ان دو مثالوں میں صاف فرماتا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔[1]

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ۔[2]

یعنی جو لوگ اس فعل کو بجا لائے کہ اُنھوں نے خُدائے تعالےٰ کی جُستجو میں پوری پُوری کوشش کی تو اس فعل کے لئے لازمی طور پر ہمارا یہ

---

[1] ۲۹: ۷۰، [2] ۶۱: ۶،

فعل ہوگا کہ ہم اُن کو اپنی راہ دِکھا دیں گے۔ اور جن لوگوں نے کجی اختیار کی اور سیدھی راہ پر چلنا نہ چاہا تو ہمارا فعل اُس کی نسبت یہ ہوگا کہ ہم اُن کے دِلوں کو کج کر دیں گے۔ اور پھر اس حالت کو زیادہ توضیح دینے کے لئے فرمایا:-

مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝[1]

یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا رہا وُہ آنے والے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اندھوں سے بدتر۔ یہ اس بات کی طرف اشارا ہے کہ نیک بندوں کو خُدا کا دیدار اِسی جہان میں ہو جاتا ہے۔ اور وُہ اسی جگ میں اپنے اُس پیارے کا درشن پا لیتے ہیں جس کے لئے وُہ سب کچھ کھوتے ہیں۔ غرض مفہوم اِس آیت کا یہی ہے کہ بہشتی زندگی کی بُنیاد اسی جہان سے پڑتی ہے اور جہنّمی نابینائی کی جڑھ بھی اِسی جہان کی گندی اور کورانہ زیست ہے اور پھر فرمایا:-

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ[2]

یعنی جو لوگ اِیمان لاتے اور اچھّے عمل بجا لاتے ہیں وُہ ان باغوں کے وارث ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ اس آیت میں خُدائے تعالیٰ نے ایمان کو باغ کے ساتھ مشابہت دی جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

---

[1] ۱۷: ۷۳؛ [2] ۲: ۲۶؛

پس واضح رہے کہ اس جگہ ایک اعلیٰ درجہ کی فلاسفی کے رنگ میں بتایا گیا ہے کہ جو رِشتہ نہروں کا باغ کے ساتھ ہے وہی رِشتہ اعمال کا ایمان کے ساتھ ہے۔ پس جیسا کہ کوئی باغ بغیر پانی کے سرسبز نہیں رہ سکتا ایسا ہی کوئی ایمان بغیر نیک کاموں کے زِندہ ایمان نہیں کہلا سکتا۔ اگر ایمان ہو اور اعمال نہ ہوں تو وُہ ایمان ہیچ ہے۔ اور اگر اعمال ہوں اور ایمان نہ ہو تو وُہ اعمال ریاکاری ہیں۔ اِسلامی بہشت کی یہی حقیقت ہے کہ وُہ اِس دُنیا کے اِیمان اور عمل کا ایک ظلّ ہے۔ وُہ کوئی نئی چیز نہیں جو باہر سے آکر انسان کو ملے گی۔ بلکہ انسان کی بہشت انسان کے اندر ہی سے نکلتی ہے۔ اور ہر ایک کی بہشت اسی کا ایمان اور اسی کے اعمالِ صالحہ ہیں۔ جن کی اِسی دُنیا میں لذّت شرُوع ہو جاتی ہے اور پوشیدہ طور پر ایمان اور اعمال کے باغ نظر آتے ہیں اور نہریں بھی دِکھائی دیتی ہیں لیکن عالمِ آخرت میں یہی باغ کھلے طور پر محسُوس ہوں گے۔ خُدا تعالیٰ کی پاک تعلیم ہمیں یہی بتلاتی ہے کہ سچّا اور پاک اور مستحکم اور کامل ایمان جو خُدا اور اس کی صفات اور اس کے ارادوں کے متعلّق ہو وُہ بہشتِ خوشنما اور بارآور درخت ہے اور اعمالِ صالحہ اِس بہشت کی نہریں ہیں جیسا کہ وُہ فرماتا ہے:۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ تُؤْتِىٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ۔[1]

---

[1] ۱۴ : ۲۵ ،

یعنی وُہ ایمانی کلمہ جو ہر ایک افراط تفریط اور نقص اور خلل اور کذب اور ہزل سے پاک اور مِن کُلِّ الوجُوہ کامل ہو۔ اس درخت کے مشابہ ہے جو ہر ایک عیب سے پاک ہو۔ جس کی جڑھ زمین میں قائم اور شاخیں آسمان میں ہوں۔ اور اپنے پھل کو ہمیشہ دیتا ہو اور کوئی وقت اس پر نہیں آتا کہ اس کی شاخوں میں پھل نہ ہوں۔ اس بیان میں خدائے تعالیٰ نے ایمانی کلمہ کو ہمیشہ پھل دار درخت سے مشابہت دے کر تین علامتیں اس کی بیان فرمائیں :-

(۱) **اوّل** یہ کہ جڑھ اس کی جو اصل مفہوم سے مُراد ہے۔ اِنسان کے دِل کی زمین میں ثابت ہو۔ یعنی انسانی فطرت اور انسانی کانشنس نے اس کی حقّانیت اور اصلیت کو قبول کر لیا ہو ؎

(۲) **دُوسری** علامت یہ ہے کہ اِس کلمہ کی شاخیں آسمان میں ہوں یعنی معقولیت اپنے ساتھ رکھتا ہو اور آسمانی قانونِ قُدرت جو خُدا کا فعل ہے اس کے مُطابق ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی صحت اور اصلیت کے دلائل قانونِ قدرت سے مستنبط ہو سکتے ہیں۔ اور نیز یہ کہ وُہ دلائِل ایسے اعلیٰ ہوں کہ گویا آسمان میں ہیں جن تک اعتراض کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا ؎

(۳) **تیسری** علامت یہ ہے کہ وُہ پھل جو کھانے کے لائق ہے دائمی اور غیر منقطع ہو۔ یعنی عملی مزاولت کے بعد اس کی برکات و تاثیرات ہمیشہ اور ہر زمانہ میں مشہود اور محسُوس ہوتی ہوں۔ یہ نہیں کہ کسی خاص زمانہ تک ظاہر ہو کر پھر آگے بند ہو جائیں ؎

اور پھر فرمایا :-

مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ [1]

یعنی پلید کلمہ اس درخت کے ساتھ مشابہ ہے جو زمین میں سے اُکھڑا ہُوا ہو۔ یعنی فطرتِ انسانی اسکو قبول نہیں کرتی اور کسی طور سے وُہ قرار نہیں پکڑتا۔ نہ دلائلِ عقلیہ کی رُو سے، نہ قانونِ قدرت کی رُو سے اور نہ کانشنس کی رُو سے۔ صرف قِصّہ اور کہانی کے رنگ میں ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ قرآنِ شریف نے عالمِ آخرت میں ایمان کے پاک درختوں کو کو انگور اور انار اور عُمدہ عمدہ میووں سے مُشابہت دی ہے اور بیان فرمایا ہے کہ اس روز وُہ ان میووں کی صُورت میں متمثّل ہوں گے۔ اور دِکھائی دیں گے۔ ایسا ہی بے اِیمانی کے خبیث درخت کا نام عالمِ آخرت میں زقُوم رکھا ہے جیسا کہ وُہ فرماتا ہے :-

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ۝ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ۝ [2]

اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ .... ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝ [3]

---

[1] ۱۴ : ۲۷، [2] ۳۷ : ۶۳ تا ۶۶، [3] ۴۴ : ۴۵ تا ۵۰ ؛

یعنی تم تبلاؤ کہ بہشت کے باغ اچھے ہیں یا زقّوم کا درخت، جو ظالموں کے لئے ایک بلا ہے۔ وُہ ایک درخت ہے جو جہنّم کی جڑھ میں سے نکلتا ہے یعنی تکبّر اور خود بینی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی دوزخ کی جڑھ ہے۔ اس کا شگوفہ ایسا ہے جیسا کہ شیطان کا سر۔ شیطان کے معنی ہیں ہلاک ہونے والا۔ یہ لفظ شَیَطَ سے نکلا ہے۔ پس حاصل کلام یہ ہے کہ اس کا کھانا ہلاک ہونا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ زقّوم کا درخت اُن دوزخیوں کا کھانا ہے جو عمداً گُناہ کو اختیار کر لیتے ہیں۔ وُہ کھانا ایسا ہے جیسا کہ تانّبا گلا ہُوا کھولتے ہُوئے پانی کی طرح پیٹ میں جوش مارنے والا۔ پھر دوزخی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اس درخت کو چکھ تو عزّت والا اور بزُرگ ہے۔ یہ کلمہ نہایت غضب کا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر تُو تکبّر نہ کرتا اور اپنی بزُرگی اور عزّت کا پاس کر کے حق سے مُنہّ نہ پھیرتا تو آج یہ تلخیاں تجھے اُٹھانی نہ پڑتیں۔ یہ آیت اِس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ دراصل یہ لفظ زقّوم کا ذُق اور اَم سے مرکّب ہے۔ اور اَم۔ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ کا ملخص ہے۔ جس میں ایک حرف پہلے کا اور ایک حرف آخر کا موجود ہے۔ اور کثرتِ استعمال نے ذال کو زا کے ساتھ بدل دیا ہے۔ اب حاصِل کلام یہ ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اِسی دُنیا کے ایمانی کلمات کو بہشت کے ساتھ مشابہت دی ہے۔ ایسا ہی اِس دُنیا کے بے ایمانی کے کلمات کو زقوم کے ساتھ مشابہت دی۔ اور اس کو دوزخ کا درخت

ٹھہرایا اور ظاہر فرما دیا کہ بہشت اور دوزخ کی جڑھ اِسی دُنیا سے شروع ہوتی ہے۔ جیسا کہ دوزخ کے باب میں ایک اَور جگہ فرماتا ہے :۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ [۱]

یعنی دوزخ وُہ آگ ہے جو خُدا کا غضب اس کا منبع ہے اور گُناہ سے بھڑکتی ہے اور پہلے دِل پر غالب ہوتی ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس آگ کی اصل جڑھ وُہ غم اور حسرتیں اور درد ہیں جو دِل کو پکڑتے ہیں کیونکہ تمام رُوحانی عذاب پہلے دِل سے ہی شرُوع ہوتے ہیں۔ اور پھر تمام بدن پر محیط ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ایک جگہ فرمایا :۔

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ [۲]

یعنی جہنّم کی آگ کا ایندھن جس سے وُہ آگ ہمیشہ افروختہ رہتی ہے دو چیزیں ہیں۔ ایک وُہ انسان جو حقیقی خُدا کو چھوڑ کر اَور اور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں یا انکی مرضی سے اُن کی پرتش کی جاتی ہے جیسا کہ فرمایا :۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ [۳]

یعنی تُم اور تمہارے معبُودانِ باطل جو انسان ہو کر خدا کہلاتے رہے جہنّم میں ڈالے جائیں گے۔ (۲) دُوسرا ایندھن جہنّم کا بُت ہیں مطلب یہ ہے کہ اِن چیزوں کا وجود نہ ہوتا تو جہنّم بھی نہ ہوتا۔ سو اِن تمام آیات سے ظاہر ہے کہ خُدائے تعالیٰ کے پاک کلام میں بہشت اور

---

[۱] ۱۰۴: ۷، ۸ ، [۲] ۲: ۲۵ ، [۳] ۲۱: ۹۹ ؛

دوزخ اس جسمانی دُنیا کی طرح نہیں ہے بلکہ ان دونوں کا مبدا، اور منبع رُوحانی امُور ہیں۔ ہاں وُہ چیزیں دُوسرے عالم میں جسمانی شکل پر نظر آئیں گی مگر اس جسمانی عالم سے نہیں ہوں گی ؎

اللہ تعالیٰ سے کامل رُوحانی تعلّق پیدا کرنیکا ذریعہ

اب ہم پھر اصل مطلب کی طرف عود کر کے کہتے ہیں کہ خُدا کے ساتھ رُوحانی اور کامل تعلّق پیدا ہونے کا ذریعہ جو قرآن شریف نے ہمیں سکھلایا ہے اسلام اور دُعائے فاتحہ ہے۔ یعنی اوّل اپنی تمام زندگی خُدا کی راہ میں وقف کر دینا اور پھر اس دُعا میں لگے رہنا جو سُورۂ فاتحہ میں مسلمانوں کو سکھلائی گئی ہے۔ تمام اسلام کا مغز یہ دونوں چیزیں ہیں۔ اسلام اور دُعائے فاتحہ۔ دُنیا میں خدا تک پہنچنے اور حقیقی نجات کا پانی پینے کیلئے یہی ایک اعلیٰ ذریعہ ہے بلکہ یہی ایک ذریعہ ہے جو قانونِ قُدرت نے انسان کی اعلیٰ ترقی اور وصالِ الٰہی کے لئے مقرر کیا ہے اور وُہی خُدا کو پاتے ہیں جو اسلام کے مفہوم کی رُوحانی آگ میں داخل ہوں اور دعائے فاتحہ میں لگے رہیں۔ اسلام کیا چیز ہے وُہی جلتی ہوئی آگ جو ہماری سفلی زندگی کو بھسم کر کے اور ہمارے باطل معبُودوں کو جلا کر سچّے اور پاک معبُود کے آگے ہماری جان اور ہمارا مال اور ہماری آبرُو کی قربانی پیش کرتی ہے۔ ایسے چشمہ میں داخل ہو کر ہم ایک نئی زندگی کا پانی پیتے ہیں اور ہماری تمام رُوحانی قوّتیں خُدا سے یُوں پیوند پکڑتی ہیں جیسا کہ

ایک رِشتہ دُوسرے رِشتہ سے پیوند کیا جاتا ہے۔ بجلی کی آگ کی طرح ایک آگ ہمارے اندر سے نکلتی ہے اور ایک آگ اُوپر سے ہم پر اُترتی ہے۔ ان دونوں شعلوں کے ملنے سے ہماری تمام ہوا و ہوس اور غیر اللہ کی محبّت بھسم ہو جاتی ہے اور ہم اپنی پہلی زندگی سے مر جاتے ہیں۔ اِس حالت کا نام قرآن شریف کی رُو سے **اِسلام** ہے۔ اسلام سے ہمارے نفسانی جذبات کو موت آتی ہے۔ اور پھر دُعا سے ہم از سرِ نو زِندہ ہوتے ہیں۔ اِس دُوسری زِندگی کے لئے الہامِ الٰہی ہونا ضرُوری ہے اِسی مرتبہ پر پہنچنے کا نام لقاءِ الٰہی ہے یعنی خُدا کا دِیدار اور خُدا کا درشن ہے۔ اِس درجہ پر پہنچ کر انسان کو خُدا سے وُہ اتّصال ہوتا ہے کہ گویا وُہ اس کو آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس کو قُوّت دی جاتی ہے۔ اور اس کے تمام حواس اور تمام اندرُونی قُوّتیں روشن کی جاتی ہیں۔ اور پاک زندگی کی کشش بڑے زور سے شرُوع ہو جاتی ہے۔ اِسی درجہ پر آکر خُدا انسان کی آنکھ ہو جاتا ہے۔ جِس کے ساتھ وُہ دیکھتا ہے اور زبان ہو جاتا ہے۔ جِس کے ساتھ وُہ بولتا ہے اور ہاتھ ہو جاتا ہے جِس کے ساتھ وُہ حملہ کرتا ہے۔ اور کان ہو جاتا ہے جِس کے ساتھ وُہ سُنتا ہے۔ اور پَیر ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وُہ چلتا ہے۔ اسی درجہ کی طرف اشارہ ہے جو خُدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ[1]

---

[1] ۴۸:۱۱،

یہ اس کا ہاتھ خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہے جو ان کے ہاتھوں پر ہے۔ اور ایسا ہی فرماتا ہے:۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ[1]

یعنی جو تو نے چلایا تو نے نہیں بلکہ خدا نے چلایا۔ غرض اس درجہ پر خدا تعالیٰ کے ساتھ کمال اتحاد ہو جاتا ہے اور خدائے تعالیٰ کی پاک مرضی روح کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے اور اخلاقی طاقتیں جو کمزور تھیں اس درجہ میں محکم پہاڑوں کی طرح نظر آتی ہیں عقل اور فراست نہایت لطافت پر آ جاتی ہے۔ یہ معنے اس آیت کے ہیں جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ[2]

اس مرتبہ میں محبت اور عشق کی نہریں ایسے طور سے جوش مارتی ہیں جو خدا تعالیٰ کے لئے مرنا اور خدا تعالیٰ کے لئے ہزاروں دکھ اٹھانا اور بے آبرو ہونا ایسا آسان ہو جاتا ہے کہ گویا ایک ہلکا سا تنکا توڑنا ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے اور نہیں جانتا کہ کون کھینچ رہا ہے۔ ایک غیبی ہاتھ اس کو اٹھائے پھرتا ہے اور خدا تعالیٰ کی مرضیوں کو پورا کرنا اس کی زندگی کا اصل الاصول ٹھہر جاتا ہے۔ اس مرتبہ میں خدائے تعالیٰ بہت ہی قریب دکھائی دیتا ہے۔ جیسا کہ اس نے فرمایا:۔

نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ[3]

---

[1] ۸: ۱۸، [2] ۵۹: ۲۳، [3] ۵۰: ۱۷،

یعنی ہم اس سے اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔ ایسی حالت میں اِس مرتبہ کا آدمی ایسا ہوتا ہے کہ جس طرح پھل پُختہ ہوکر خود بخود درخت پر سے گِر جاتا ہے۔ اسی طرح اِس مرتبہ کے آدمی کے تمام تعلّقاتِ سفلی کالعدم ہو جاتے ہیں۔ اس کا اپنے خدا تعالےٰ سے ایسا گہرا تعلّق ہو جاتا ہے۔ اور وہ مخلُوق سے دُور چلا جاتا اور خدا تعالیٰ کے مکالمات اور مخاطبات سے شرف پاتا ہے۔ اِس مرتبہ کے حاصل کرنے کے لئے اب بھی دروازے کُھلے ہیں جیسے کہ پہلے کُھلے ہُوئے تھے۔ اور اب بھی خُدا تعالےٰ کا فضل یہ نعمت ڈھُونڈنے والوں کو دیتا ہے جیسا کہ پہلے دیتا تھا۔ مگر یہ راہ محض زبان کی فضُولیوں کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی۔ اور فقط بے حقیقت باتوں اور لافوں سے یہ دروازہ نہیں کُھلتا۔ چاہنے والے بہُت ہیں مگر پانے والے کم۔ اس کا کیا سبب ہے۔ یہی کہ یہ مرتبہ سچّی سرگرمی، سچّی جاں فشانی پر موقوف ہے۔ باتیں قیامت تک کیا کرو۔ کیا ہو سکتا ہے۔ صِدق سے اُس آگ پر قدم رکھنا جس کے خوف سے اَور لوگ بھاگتے ہیں اس راہ کی پہلی شرط ہے۔ اگر عملی سرگرمی نہیں تو لاف زنی ہیچ ہے۔ اِس بارے میں اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے:۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ [۱]

[۱] ۲ : ۱۸۷

یعنی اگر میرے بندے میری نسبت سوال کریں کہ وُہ کہاں ہے تو اُن کو کہہ کہ وُہ تم سے بُہت ہی قریب ہے۔ مَیں دُعا کرنے والے کی دُعا سُنتا ہُوں۔ پس چاہئے کہ وُہ دُعاؤں سے میرا وصل ڈھُونڈیں اور مُجھ پر ایمان لاویں تا کامیاب ہوویں ؀

دُوسرا سَوال

مَوت کے بعد انسان کی کیا حالت ہوتی ہے؟

سو اِس سوال کے جواب میں یہ گُذارِش ہے کہ موت کے بعد جو کُچھ انسان کی حالت ہوتی ہے درحقیقت وُہ کوئی نئی حالت نہیں ہوتی بلکہ وُہی دُنیا کی زِندگی کی حالتیں زیادہ صفائی سے کھُل جاتی ہیں۔ جو کُچھ انسان کے عقائد اور اعمال کی کیفیّت صالحہ یا غیر صالحہ ہوتی ہے۔ وُہ اِس جہان میں مخفی طور پر اس کے اندر ہوتی ہے۔ اور اس کا تریاق یا زہر ایک چھُپی ہوئی تاثیر انسانی وُجود پر ڈالتا ہے۔ مگر آنے والے جہان میں ایسا نہیں رہے گا۔ بلکہ وُہ تمام کیفیات کھلا کھلا اپنا چہرہ دِکھلائیں گی۔ اِس کا نمُونہ عالمِ خواب میں پایا جاتا ہے کہ انسان کے بدن پر جس قسم کے مواد غالب ہوتے ہیں عالمِ خواب میں اُسی قسم کی جسمانی حالتیں نظر آتی ہیں۔ جب کوئی تیز تپ چڑھنے کو ہوتا ہے تو خواب میں اکثر آگ اور

آگ کے شعلے نظر آتے ہیں اور بلغمی تپوں اور ریزش اور زکام کے غلبہ میں انسان اپنے تئیں پانی میں دیکھتا ہے۔ غرض جس طرح کی بیماریوں کے لئے بدن نے تیاری کی ہو وہ کیفیتیں تمثّل کے طور پر خواب میں نظر آجاتی ہیں۔ پس خواب کے سلسلہ پر غور کرنے سے ہر ایک انسان سمجھ سکتا ہے کہ عالمِ ثانی میں بھی یہی سُنّت اللہ ہے کیونکہ جس طرح خواب ہم میں ایک خاص تبدیلی پیدا کرکے روحانیت کو جسمانی طور پر تبدیل کرکے دکھلاتا ہے اُس عالم میں بھی یہی ہوگا۔ اور اس دن ہمارے اعمال اور اعمال کے نتائج جسمانی طور پر ظاہر ہوں گے اور جو کچھ ہم اس عالم سے مخفی طور پر ساتھ لے جائیں گے وہ سب اُس دن ہمارے چہرے پر نمودار نظر آئے گا اور جیسا کہ انسان جو کچھ خواب میں طرح طرح کے تمثلات دیکھتا ہے اور کبھی گمان نہیں کرتا کہ یہ تمثلات ہیں بلکہ انہیں واقعی چیزیں یقین کرتا ہے ایسا ہی اس عالم میں ہوگا۔ بلکہ خدا تعالیٰ تمثلات کے ذریعہ سے اپنی نئی قدرت دکھائے گا۔ چونکہ وہ قدرتِ کامل ہے۔ پس اگر ہم تمثلات کا نام بھی نہ لیں اور یہ کہیں کہ وہ خدا کی قدرت سے ایک نئی پیدائش ہے تو یہ تقریر بہت درست اور واقعی اور صحیح ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ[1]

یعنی کوئی نفس نیکی کرنے والا نہیں جانتا کہ وہ کیا کیا نعمتیں ہیں جو اس کیلئے

---

[1] ۳۲ : ۱۹،

مخفی ہیں۔ سو خُدا تعالیٰ نے اِن تمام نعمتوں کو مخفی قرار دِیا جن کا دُنیا کی نعموں میں نمُونہ نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دُنیا کی نعمتیں ہم پر مخفی نہیں ہیں اور دُودھ اور انار اور انگور وغیرہ کو ہم جانتے ہیں اور ہمیشہ یہ چیزیں کھاتے ہیں تو اس سے معلوم ہُوا کہ وُہ چیزیں اَور ہیں۔ اور اُن کو اِن چیزوں سے صرف نام کا اِشتراک ہے۔ پس جس نے بہشت کو دُنیا کی چیزوں کا مجمُوعہ سمجھا اُس نے قرآن شریف کا ایک حرف بھی نہیں سمجھا ؛

اِس آیت کی شرح میں جو ابھی مَیں نے ذِکر کی ہے ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلیّ اللہ علیہِ وسلّم فرماتے ہیں کہ بہشت اور اس کی نعمتیں وُہ چیزیں ہیں جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سُنیں۔ اور نہ دِلوں میں کبھی گُذریں۔ حالانکہ ہم دُنیا کی نعمتوں کو آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں۔ اور کانوں سے بھی سُنتے ہیں اور دِل میں بھی وُہ نعمتیں گُذرتی ہیں۔ پس جب کہ خُدا تعالیٰ اور رسُولؐ اس کا ان چیزوں کو ایک نرالی چیزیں بتلاتا ہے تو ہم قرآن سے دُور جا پڑتے ہیں۔ اگر یہ گمان کریں کہ بہشت میں بھی دُنیا کا ہی دُودھ ہوگا جو گائیوں اور بھینسوں سے دوہا جاتا ہے۔ گویا دُودھ دینے والے جانوروں کے وہاں ریوڑ موجود ہوں گے۔ اور درختوں پر شہد کی مکھیوں نے بہُت سے چھتّے لگائے ہُوئے ہونگے۔ اور فرشتے تلاش کر کے وُہ شہد نکالیں گے اور نہروں میں ڈالیں گے۔ کیا ایسے خیالات اس تعلیم سے کچُھ مناسبت رکھتے ہیں جس میں یہ آیتیں موجود ہیں کہ دُنیا نے اِن چیزوں کو کبھی نہیں دیکھا اور وُہ چیزیں رُوح کو روشن

کرتی ہیں اور خدا کی معرفت بڑھاتی ہیں اور رُوحانی غذائیں ہیں ۔ گو اِن غذاؤں کا تمام نقشہ جسمانی رنگ پر ظاہر کیا گیا ہے ۔ مگر ساتھ ساتھ بتا یا گیا ہے کہ ان کا سرچشمہ رُوح اور راستی ہے ۔ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت سے یہ پایا جاتا ہے کہ جو جو نعمتیں بہشت میں دی جائینگی اُن نعمتوں کو دیکھ کر بہشتی لوگ اُن کو شناخت کر لیں گے کہ یہی نعمتیں ہمیں پہلے بھی ملی تھیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے :-

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا[1]

یعنی جو لوگ ایمان لانے والے اور اچھے کام کرنے والے ہیں جن میں ذرہ فساد نہیں اُن کو خوشخبری دے کہ وُہ اس بہشت کے وارث ہیں جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں ۔ جب وُہ عالمِ آخرت میں اُن درختوں کے اُن پھلوں میں سے جو دُنیا کی زِندگی میں ہی اُن کو مل چکے تھے پائیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو وُہ پھل ہیں جو ہمیں پہلے ہی دِیئے گئے تھے ۔ کیونکہ وُہ اُن پھلوں کو ان پہلے پھلوں سے مشابہ پائیں گے ۔ اب یہ گمان کہ پہلے پھلوں سے مُراد دُنیا کی جسمانی نعمتیں ہیں بالکل غلطی ہے ۔ اور آیت کے بدیہی معنے اور اس کے منطوق کے بالکل خلاف ہے ۔ بلکہ اللہ جلّ شانہٗ

---

[1] ۲ : ۲۶ -

اِس آیت میں یہ فرماتا ہے کہ جو لوگ اِیمان لائے اور اعمال صالحہ کئے اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک بہشت بنایا ہے جِس کے درخت ایمان اور جس کی نہریں اعمالِ صالحہ ہیں۔ اِسی بہشت کا وُہ آئندہ بھی پھل کھائیں گے۔ اور وُہ پھل زیادہ نمایاں اور شیریں ہوگا۔ اور چونکہ وُہ رُوحانی طور پر اسی پھل کو دُنیا میں کھا چُکے ہونگے اِس لئے دُوسری دُنیا میں اس پھل کو پہچان لیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو وُہی پھل معلوم ہوتے ہیں کہ جو پہلے ہمارے کھانے میں آچکے ہیں اور اس پھل کو اس پہلی خوراک سے مشابہ پائیں گے۔ سو یہ آیت صریح بتا رہی ہے کہ جو لوگ دُنیا میں خُدا کی محبت اور پیار کی غذا کھاتے تھے اب جسمانی شکل پر وُہی غذا ان کو ملے گی۔ اور چونکہ وُہ پریت اور محبت کا مزا چکھ چکے تھے اور اس کی کیفیت سے آگاہ تھے۔ اِس لئے ان کی رُوح کو وُہ زمانہ یاد آجائے گا کہ جب وُہ گوشوں اور خلوتوں میں اور رات کے اندھیروں میں محبت کے ساتھ اپنے محبوبِ حقیقی کو یاد کرتے اور اِس یاد سے لذّت اُٹھاتے تھے۔

غرض اِس جگہ جسمانی غذاؤں کا کچُھ ذِکر نہیں۔ اور اگر کسی کے دِل میں یہ خیال پَیدا ہو کہ جب کہ رُوحانی طور پر عارفوں کو یہ غذا دُنیا میں مِل چکی تھی تو پھر یہ کہنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ وُہ ایسی نعمتیں ہیں کہ نہ دُنیا میں کسی نے دیکھیں نہ سُنیں اور نہ کسی کے دِل میں گذریں۔ اور اس صُورت میں ان دونوں آیتوں میں تناقض پایا جاتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تناقض اس صورت میں ہوتا کہ جب اِس آیت میں دُنیا کی نعمتیں مُراد ہوتیں۔ لیکن

جب اس جگہ دُنیا کی نعمتیں مُراد نہیں ہیں جو کُچھ عارف کو معرفت کے رنگ میں مِلتا ہے وُہ درحقیقت دُوسرے جہان کی نعمت ہوتی ہے۔ جس کا نمُونہ شوق دِلانے کے لِئے پہلے ہی دِیا جاتا ہے ❖

یاد رکھنا چاہیئے کہ باخُدا آدمی دُنیا میں سے نہیں ہوتا۔ اِسی لئے تو دُنیا اس سے بُغض رکھتی ہے بلکہ وُہ آسمان سے ہوتا ہے۔ اِس لِئے آسمانی نعمت اس کو مِلتی ہے۔ دُنیا کا آدمی دُنیا کی نعمتیں پاتا ہے۔ اور آسمان کا آسمانی نعمتیں حاصل کرتا ہے۔ سو یہ بالکل سچ ہے کہ وُہ نعمتیں دُنیا کے کانوں اور دُنیا کے دِلوں اور دُنیا کی آنکھوں سے چھپائی گئیں۔ لیکن جس کی دُنیوی زندگی پر موت آجائے اور وُہ پیالہ رُوحانی طور پر اُس کو پلایا جائے جو آگے جسمانی طور پر پیا جائے گا۔ اُس کو یہ پینا اُس وقت یاد آئیگا جب کہ وُہی پیالہ جسمانی طور پر اُس کو دِیا جائے گا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وُہ اِس نعمت سے دُنیا کی آنکھ اور کان وغیرہ کو بے خبر سمجھے گا۔ چونکہ وُہ دُنیا میں تھا اگرچہ دُنیا میں سے نہیں تھا۔ اِس لئے وُہ بھی گواہی دے گا کہ دُنیا کی نعمتوں سے وُہ نعمت نہیں۔ نہ دُنیا میں اسکی آنکھ نے ایسی نعمت دیکھی نہ کان نے سُنی اور نہ دِل میں گُذری۔ لیکن دُوسری زندگی میں اس کے نمُونے دیکھے جو دُنیا میں سے نہیں تھے۔ بلکہ وُہ آنے والے جہان کی ایک خبر تھی۔ اور اُس سے اس کا رِشتہ اور تعلّق تھا۔ دُنیا سے کچُھ تعلّق نہیں تھا ❖

عالمِ معاد کے متعلق تین قرآنی معارف

اب قاعدۂ کُلّی کے طور پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ موت کے بعد جو حالتیں پیش آتی ہیں قرآن شریف نے اُنھیں تین قسم پر منقسم کیا ہے۔ اور عالمِ معاد کے متعلق یہ تین قرآنی معارف ہیں جن کو ہم جُدا جُدا اِس جگہ ذِکر کرتے ہیں ؎

پہلا دقیقۂ معرفت

اوّل یہ دقیقۂ معرفت ہے کہ قرآن شریف بار بار یہی فرماتا ہے کہ عالمِ آخرت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے تمام نظّارے اسی دُنیوی زندگی کے اظلال و آثار ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے :۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۔[1]

یعنی ہم نے اِسی دُنیا میں ہر ایک شخص کے اعمال کا اثر اُس کی گردن سے باندھ رکھّا ہے اور انہیں پوشیدہ اثروں کو ہم قیامت کے دِن ظاہر کریں گے اور ایک کُھلے کُھلے اعمال نامہ کی شکل پر دِکھلائیں گے۔ اِس آیت میں جو طائِر کا لفظ ہے تو واضح ہو کہ طائر اصل میں پرندہ کو کہتے ہیں۔ پھر اِستعارہ کے طور پر اس سے مُراد عمل بھی لیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک عمل نیک ہو یا

---

[1] ۱۷ : ۱۴ ،

بد ہو وُہ وقوع کے بعد پرندہ کی طرح پرواز کر جاتا ہے اور مشقت یا لذت اس کی کالعدم ہو جاتی ہے۔ اور دل پر اس کی کثافت یا لطافت باقی رہ جاتی ہے۔

یہ قرآنی اصول ہے کہ ہر ایک عمل پوشیدہ طور پر اپنے نقوش جماتا رہتا ہے۔ جس طور کا انسان کا فعل ہوتا ہے۔ اس کے مناسب حال ایک خدا تعالیٰ کا فعل صادر ہوتا ہے۔ اور وُہ فعل اس گناہ کو یا اس کی نیکی کو ضائع ہونے نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے نقوش دِل پر، مُنہ پر، آنکھوں پر کانوں پر، ہاتھوں پر، پیروں پر لکھے جاتے ہیں۔ اور یہی پوشیدہ طور پر ایک اعمال نامہ ہے جو دُوسری زندگی میں کھُلے طور پر ظاہر ہو جائے گا۔

اور پھر دُوسری جگہ بہشتیوں کے بارے میں فرماتا ہے:۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ[1]

یعنی اس دِن بھی ایمانی نور جو پوشیدہ طور پر مومنوں کو حاصل ہے کھُلے کھُلے طور پر اُن کے آگے اور اُن کے داہنے ہاتھ پر دوڑتا ہُوا نظر آئے گا۔ پھر ایک اَور جگہ بدکاروں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ○ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ○ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ كَلَّا لَوْ

---

[1] ۱۳:۵۷

تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ○ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ○ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ○ ؎

یعنی دُنیا کی کثرتِ حرص و ہوا نے تمھیں آخرت کی تلاش سے روک رکھا یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پڑے۔ دُنیا سے دِل مت لگاؤ۔ تم عنقریب جان لوگے کہ دُنیا سے دِل لگانا اچھا نہیں۔ پھر مَیں کہتا ہُوں کہ عنقریب تُم جان لوگے کہ دُنیا سے دِل لگانا اچّھا نہیں۔ اگر تمھیں یقینی علم حاصل ہو تو تم دوزخ کو اسی دُنیا میں دیکھ لوگے۔ پھر برزخ کے عالم میں یقین کی آنکھوں کیساتھ دیکھوگے۔ پھر عالمِ حشرِ اجساد میں پُورے مؤاخذہ میں آجاؤگے۔ اور وُہ عذاب تم پر کامل طور پر وارد ہو جائیگا اور صرف قال سے نہیں بلکہ حال سے تمھیں دوزخ کا علم حاصل ہو جائیگا۔

عِلم کی تین قسمیں

اِن آیات میں اللہ تعالےٰ نے صاف فرما دِیا ہے کہ اِسی جہان میں بدکاروں کے لئے جہنّمی زندگی پوشیدہ طور پر ہوتی ہے۔ اور اگر غور کریں تو اپنی دوزخ کو اِسی دنیا میں دیکھ لیں گے۔ اور اِس جگہ اللہ تعالیٰ نے عِلم کو تین درجوں پر منقسم کیا ہے۔ یعنی علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔ اور عام کے سمجھنے کے لئے اِن تینوں علموں کی یہ مثالیں ہیں کہ اگر مثلاً ایک شخص دُور سے کسی جگہ بہت سا دھُواں دیکھے اور اور دھُوئیں سے ذہن منتقل ہو کر آگ کی طرف چلا جائے اور آگ کے وجُود کا یقین کرے اور اس خیال سے کہ دھُوئیں اور آگ میں ایک تعلّقِ لاینفک اور ملازمتِ تامّہ ہے جہاں دھُواں ہوگا ضرور ہے کہ وہاں آگ بھی ہو پس اِس

؎ ۱۰۲ : ۱ تا ۸۔

علم کا نام علم الیقین ہے۔ اور پھر جب آگ کے شُعلے دیکھ لے تو اس کا نام عین الیقین ہے۔ اور جب اس آگ میں آپ ہی داخل ہو جائے تو اس علم کا نام حق الیقین ہے۔ اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جہنّم کے وجود کا علم الیقین تو اِسی دُنیا میں ہو سکتا ہے۔ پھر عالم برزخ میں عین الیقین حاصل ہوگا۔ اور عالم حشر اجساد میں وُہی علم حق الیقین کے کامل مرتبہ تک پہنچے گا ؛

تین عالم

اِس جگہ واضح رہے کہ قرآنی تعلیم کی رُو سے تین عالم ثابت ہوتے ہیں :۔

اوّل ۔ دُنیا جس کا نام عالمِ کسب اور نشاء اولیٰ ہے ۔ اسی دُنیا میں انسان اکتساب نیکی کا یا بدی کا کرتا ہے ۔ اور اگرچہ عالمِ بعث میں نیکوں کے واسطے ترقّیات ہیں مگر وُہ محض خُدا کے فضل سے ہیں انسان کے کسب کو ان میں دخل نہیں ؛

(۲) اور دُوسرے عالم کا نام برزخ ہے ۔ اصل میں لفظِ برزخ لُغتِ عرب میں اُس چیز کو کہتے ہیں کہ جو دو چیزوں کے درمیان واقع ہو سو چونکہ یہ زمانہ عالمِ بعث اور عالم نشاءِ اولیٰ میں واقع ہے۔ اِس لئے اس کا نام برزخ ہے ۔ لیکن یہ لفظ قدیم سے اور جب سے کہ دُنیا کی بناء پڑی عالمِ درمیانی پر بولا گیا ہے ۔ اِس لئے اِس لفظ میں عالمِ درمیانی کے وجُود پر ایک عظیم الشّان شہادت مخفی ہے۔ ہم منن الرحمٰن میں ثابت کر چکے ہیں کہ عربی کے الفاظ وُہ الفاظ ہیں جو خُدا کے مُنہ سے

نکلے ہیں۔ اور دُنیا میں فقط یہی ایک زبان ہے جو خُدائے قدّوس کی زبان اور قدیم اور تمام علوم کا سرچشمہ اور تمام زبانوں کی ماں اور خُدا کی وحی کا پہلا اور آخری تخت گاہ ہے۔ اور خُدا کی وحی کا پہلا تخت گاہ اِس لئے کہ تمام عربی خُدا کا کلام تھا جو قدیم سے خُدا کے ساتھ تھا۔ پھر وہی کلام دُنیا میں اُترا اور دُنیا نے اس سے اپنی بولیاں بنائیں۔ اور آخری تخت گاہ خُدا کا اِس لئے لُغتِ عربی ٹھہری۔ کہ آخری کتاب خُدائے تعالےٰ کی جو قرآنِ شریف ہے عربی میں نازل ہوئی۔ سو برزخ عربی لفظ ہے جو مرکّب ہے زخّ اور برّ سے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ طریق کسب اعمال ختم ہوگیا۔ اور ایک مخفی حالت میں پڑ گیا۔ برزخ کی حالت وُہ حالت ہے کہ جب یہ ناپائیدار ترکیب انسانی تفرق پذیر ہو جاتی ہے اور رُوح الگ اور جسم الگ ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ جسم کسی گڑھے میں ڈال دِیا جاتا ہے اور رُوح بھی ایک قسم کے گڑھے میں پڑجاتی جس پر لفظ زخ دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ وُہ افعال کسب خیر یا شر پر قادر نہیں ہوسکتی کہ جو جسم کے تعلّقات سے اس سے صادر ہو سکتے تھے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہماری رُوح کی عُمدہ صحت جسم پر موقوف ہے۔ دماغ کے ایک خاص حِصّہ پر چوٹ لگنے سے حافظہ جاتا رہتا ہے۔ اور دُوسرے حِصّہ پر آفت پہنچنے سے قوّتِ متفکّرہ رُخصت ہوتی ہے۔ اور تمام ہوش وحواس رُخصت ہو جاتے ہیں۔ اور دماغ میں جب کسی قسم کا تشنّج ہو جائے یا ورم پیدا ہو یا خُون یا کوئی اَور مادہ ٹھہر جائے اور کسی سدّہ تام یا غیر تام کو پیدا

کرے تو غشی یا مرگی یا سکتہ معاً لاحق ہو جاتا ہے۔ پس ہمارا قدیم کا تجربہ ہمیں یقینی طور پر سکھلاتا ہے کہ ہماری رُوح بغیر تعلّق جسم کے بالکل نکمّی ہے۔ سو یہ بات بالکل باطل ہے کہ ہم ایسا خیال کریں کہ کسی وقت میں ہماری مجرّد رُوح جس کے ساتھ جسم نہیں ہے کسی خوشحالی کو پا سکتی ہے۔ اگر ہم قِصّہ کے طور پر اس کو قبول کریں تو کریں لیکن معقولی طور پر اس کے ساتھ کوئی دلیل نہیں۔ ہم بالکل سمجھ نہیں سکتے کہ وُہ ہماری رُوح جو جسم کے ادنیٰ ادنیٰ خلل کے وقت بیکار ہو کر بیٹھ جاتی ہے وہ اُس روز کیونکر کامل حالت پر رہے گی۔ جب کہ بالکل جسم کے تعلّقات سے محروم کی جائیگی۔ کیا ہر روز ہمیں تجربہ نہیں سمجھاتا کہ رُوح کی صحّت کے لئے جسم کی صحّت ضروری ہے۔ جب ایک شخص ہم میں سے پیرِ فرتُوت ہو جاتا ہے تو ساتھ ہی اسکی رُوح بھی بُوڑھی ہو جاتی ہے۔ اس کا تمام عِلمی سرمایہ بُڑھاپے کا چور چُرا کر لے جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے:۔

لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا۔[1]

یعنی انسان بُڈھا ہو کر ایسی حالت تک پہنچ جاتا ہے کہ پڑھ پڑھا کر پھر جاہل بن جاتا ہے۔ پس ہمارا یہ مشاہدہ اس بات پر کافی دلیل ہے کہ رُوح بغیر جسم کے کچُھ چیز نہیں۔ پھر یہ خیال بھی انسان کو حقیقی سچّائی کی طرف توجّہ دِلاتا ہے کہ اگر رُوح بغیرِ جسم کے کچُھ ہوتی تو خدائے تعالےٰ کا یہ کام لغو ٹھہرتا کہ اس کو خواہ نخواہ جسمِ فانی سے پیوند دے دیتا۔ اور پھر

---

[1] ۲۲ : ۶،

یہ بھی سوچنے کے لائق ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو غیر متناہی ترقیات کے لئے پیدا کیا ہے۔ پس جس حالت میں انسان اِس مختصر زندگی کی ترقیات کو بغیر رفاقتِ جسم کے حاصل نہیں کر سکتا۔ تو کیونکر اُمید رکھیں کہ ان نامتناہی ترقیات کو جو ناپیدا کنار ہیں بغیر رفاقتِ جسم کے خود بخود حاصل کر لے گا ﴿

سو اِن تمام دلائل سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ رُوح کے افعال کاملہ صادر ہونے کے لئے اِسلامی اصول کے رُو سے جسم کی رفاقت رُوح کے ساتھ دائمی ہے۔ گو موت کے بعد یہ فانی جسم رُوح سے الگ ہو جاتا ہے۔ مگر عالم برزخ میں مستعار طور پر ہر ایک رُوح کو کسی قدر اپنے اعمال کا مزہ چکھنے کے لئے جسم مِلتا ہے۔ وُہ جسم اس جسم کی قسم میں سے نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک نُور یا ایک تاریکی سے جیسا کہ اعمال کی صُورت ہو جسم تیار ہوتا ہے۔ گویا کہ اِس عالم میں انسان کی عملی حالتیں جسم کا کام دیتی ہیں۔ ایسا ہی خُدا کے کلام میں بار بار ذکر آیا ہے۔ اور بعض جسم نورانی اور بعض ظُلمانی قرار دِئے ہیں جو اعمال کی روشنی یا اعمال کی ظُلمت سے تیّار ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ راز ایک نہایت دِقیق راز ہے مگر غیر معقول نہیں۔ انسانِ کامل اسی زِندگی میں ایک نورانی وجود اِس کیفیتِ جسم کے علاوہ پا سکتا ہے۔ اور عالمِ مکاشفات میں اس کی بہُت مثالیں ہیں۔ اگرچہ ایسے شخص کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے جو صرف ایک موٹی عقل کی حد تک ٹھہرا ہوُا ہے۔ لیکن جن کو عالمِ مکاشفات میں سے کچھ حِصّہ ہے۔ وُہ اِس قسم کے جسم کو جو اعمال سے تیار ہوتا ہے تعجب اور

استبعاد کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے بلکہ اس مضمون سے لذّت اُٹھائیں گے ؀

غرض یہ جسم جو اعمال کی کیفیت سے ملتا ہے یہی عالمِ برزخ میں نیک و بد کی جزا کا موجب ہو جاتا ہے ۔ مَیں اس میں صاحبِ تجربہ ہوں ۔ مجھے کشفی طور پر عین بیداری میں بارہا بعض مُردوں کی مُلاقات کا اتفاق ہُوا ہے اور مَیں نے بعض فاسقوں اور گمراہی اختیار کرنے والوں کا جسم ایسا سیاہ دیکھا ہے کہ گویا وُہ دھوئیں سے بنایا گیا ہے ۔ غرض مَیں اس کوچہ سے ذاتی واقفیت رکھتا ہُوں اور مَیں زور سے کہتا ہُوں کہ جیسا کہ خُدائے تعالےٰ نے فرمایا ہے ایسا ہی ضرور مرنے کے بعد ہر ایک کو ایک جسم ملتا ہے ۔ خواہ نُورانی خواہ ظلمانی ۔ انسان کی یہ غلطی ہو گی اگر وُہ ان نہایت باریک معارف کو صرف عقل کے ذریعہ سے ثابت کرنا چاہے ۔ بلکہ جاننا چاہیئے کہ جیسا کہ آنکھ شیریں چیز کا مزہ نہیں بتلا سکتی اور نہ زبان کسی چیز کو دیکھ سکتی ہے ۔ ایسا ہی وُہ علومِ معاد جو پاک مکاشفات سے حاصل ہو سکتے ہیں ۔ صرف عقل کے ذریعہ سے ان کا عُقدہ حل نہیں ہو سکتا ۔ خُدائے تعالیٰ نے اِس دُنیا میں مجہُولات کے جاننے کے لئے علیحدہ علیحدہ وسائل رکھے ہیں ۔ پس ہر ایک چیز کو اس کے وسیلہ کے ذریعہ سے ڈھُونڈو تب اُسے پا لو گے ؀

ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ خُدا نے ان لوگوں کو جو بدکاری اور گمراہی میں پڑ گئے اپنے کلام میں مُردہ کے نام سے موسوم کیا ہے اور نیکو کاروں کو زندہ قرار دیا ہے ۔ اس میں بھید یہ ہے کہ جو لوگ خُدا تعالیٰ سے غافل ہوئے اُن کی زندگی کے اسباب جو کھانا پینا اور شہوتوں

کی پیروی تھی منقطع ہو گئے۔ اور رُوحانی غذا سے اُن کو کچھ حصّہ نہ تھا پس وہ درحقیقت مر گئے اور وُہ صرف عذاب اُٹھانے کے لئے زندہ ہونگے۔ اسی بھید کی طرف اللہ جلّ شانہٗ نے اشارہ فرمایا ہے۔ جیسا کہ کہتا ہے:-

وَمَنْ يَّأْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى[1]

یعنی جو شخص مُجرم بن کر خُدا کے پاس آئے گا تو اُس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ وُہ اس میں نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ مگر جو لوگ خُدا تعالیٰ کے محبّ ہیں وُہ موت سے نہیں مرتے۔ کیونکہ ان کا پانی اور اُن کی روٹی اُن کے ساتھ ہوتی ہے۔ پھر برزخ کے بعد وُہ زمانہ ہے جس کا نام عالمِ بعث ہے۔ اس زمانہ میں ہر ایک رُوح نیک ہو یا بد، صالح ہو یا فاسق ایک کھلا کھلا جسم حاصل کرے گی۔ اور یہ دِن خُدا کی اُن پُوری تجلّیات کے لئے مقرّر کیا گیا ہے جس میں ہر ایک انسان اپنے ربّ کی ہستی سے پُورے طور پر واقف ہو جائیگا اور ہر ایک شخص اپنے جزاء کے انتہائی نقطہ تک پہنچے گا۔ یہ تعجّب نہیں کرنا چاہیئے کہ خُدا سے یہ کیونکر ہو سکے گا۔ کیونکہ وُہ ہر ایک قدرت کا مالک ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے جیسا کہ وُہ خود فرماتا ہے:-

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا

---

[1] ۲۰ : ۷۵ ،

الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلۡقٍ عَلِیۡمُۨ ۝ ......
اَوَلَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ
بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؕ بَلٰی ٭ وَ هُوَ الۡخَلّٰقُ
الۡعَلِیۡمُ ۝ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ
لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ ۝ فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِهٖ مَلَكُوۡتُ
كُلِّ شَیۡءٍ وَّ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ۝[۱]

یعنی کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو ایک قطرہ پانی سے پیدا کیا جو رِحم میں ڈالا گیا تھا۔ پھر وُہ ایک جھگڑنے والا آدمی بن گیا۔ ہمارے لئے باتیں بنانے لگا اور اپنی پیدائش بھول گیا اور کہنے لگا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جب ہڈّیاں بھی سلامت نہیں رہیں گی تو پھر انسان نئے سرے سے زندہ ہوگا۔ ایسی قُدرت والا کون ہے جو اسکو زندہ کرے گا۔ ان کو کہہ وُہی زندہ کرے گا جس نے پہلے اس کو پیدا کیا تھا۔ اور وُہ ہر ایک قسم سے اور ہر ایک راہ سے زندہ کرنا جانتا ہے۔ اس کے حُکم کی یہ شان ہے کہ جب کسی چیز کے ہونے کا ارادہ کرتا ہے تو صرف یہی کہتا ہے کہ ہو۔ پس وُہ چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ پس وُہ ذات پاک ہے جس کی ہر ایک چیز پر بادشاہی ہے۔ اور تم اُسی کی طرف رجُوع کروگے۔ سو اِن آیات میں اللہ جلّ شانہٗ نے فرما دیا ہے کہ خُدا کے آگے کوئی چیز اَن ہونی نہیں۔ جس نے ایک قطرۂ حقیر سے اِنسان کو پیدا کیا، کیا وُہ دُوسری مرتبہ پیدا کرنے سے

---

[۱] ۳۶ : ۷۸، ۸۴

عاجز ہے؟

اِس جگہ ایک اَور سوال ناواقفوں کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ اور وُہ یہ ہے کہ جس حالت میں تیسرا عالم جو عالمِ بعث ہے مُدّتِ دراز کے بعد آئے گا تو اس صُورت میں ہر ایک نیک و بد کے لئے عالمِ برزخ بطور حوالات کے ہُوا جو ایک امرِ عبث معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا سمجھنا سراسر غلطی ہے جو محض ناواقفی سے پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ خُدا تعالیٰ کی کتاب میں نیک و بد کی جزا کے لئے دو مقام پائے جاتے ہیں۔ ایک عالمِ برزخ جس میں مخفی طور پر ہر ایک شخص اپنی جزا پائیگا۔ بُرے لوگ مرنے کے بعد ہی جہنّم میں داخل ہونگے۔ نیک لوگ مرنے کے بعد ہی جنّت میں آرام پائیں گے۔ چنانچہ اِس قسم کی آیتیں قرآن شریف میں بکثرت ہیں کہ بمجرّد موت کے ہر ایک انسان اپنے اعمال کی جزا دیکھ لیتا ہے۔ جیسا کہ خُدائے تعالےٰ ایک بہشتی کے بارے میں خبر دیتا ہے۔ اور فرماتا ہے:۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ [1]

یعنی اس کو کہا گیا کہ تُو بہشت میں داخل ہو۔ اور ایسا ہی ایک دوزخی کی خبر دے کر فرماتا ہے:۔

فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝ [2]

یعنی ایک بہشتی کا ایک دوست دوزخی تھا۔ جب وُہ دونوں مر گئے

---

[1] ۳۶ : ۲۷ ، [2] ۳۷ : ۵۶ ،

بہشتی حیران تھا کہ میرا دوست کہاں ہے۔ پس اس کو دکھلایا گیا کہ وہ جہنم کے درمیان ہے۔ سو جزا سزا کی کارروائی تو بلا توقف شروع ہو جاتی ہے اور دوزخی دوزخ میں اور بہشتی بہشت میں جاتے ہیں۔ مگر اس کے بعد ایک اَور تجلّی اعلیٰ کا دِن ہے جو خُدا کی بڑی حکمت نے اُس دِن کے ظاہر کرنے کا تقاضا کیا ہے۔ کیونکہ اس نے انسان کو پَیدا کِیا تا وُہ اپنی خالقیت کے ساتھ شناخت کیا جائے۔ اور پھر وُہ سب کو ہلاک کریگا۔ تاکہ وُہ اپنی قہاریت کے ساتھ شناخت کیا جائے۔ اور پھر ایک دِن سب کو کامل زِندگی بخش کر ایک میدان میں جمع کرے گا تاکہ وُہ اپنی قادریت کے ساتھ پہچانا جائے۔ اب جاننا چاہیئے کہ دقائقِ مذکورہ میں سے یہ پہلا دقیقۂ معرفت تھا جس کا بیان ہُوا ؂

دُوسرا دقیقۂ معرفت

دُوسرا دقیقۂ معرفت جس کو عالمِ معاد کے متعلّق قرآن شریف نے ذِکر فرمایا ہے وُہ یہ ہے کہ عالمِ معاد میں وُہ تمام امُور جو دُنیا میں رُوحانی تھے جسمانی طور پر متمثّل ہوں گے۔ خواہ عالمِ معاد میں برزخ کا درجہ ہو یا عالمِ بعث کا درجہ، اس بارے میں جو کچھ خُدائے تعالیٰ نے فرمایا اس میں سے ایک یہ آیت ہے :۔

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ (۱۷ : ۷۳)

یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا ہوگا وہ دُوسرے جہان میں بھی اندھا ہوگا۔ اِس آیت کا مقصد یہ ہے کہ اس جہان کی رُوحانی نابینائی اس جہان میں جسمانی طور پر مشہود اور محسوس ہوگی۔ ایسا ہی دُوسری آیت میں فرماتا ہے :۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ؎

یعنی اس جہنمی کو پکڑو۔ اس کی گردن میں طوق ڈالو۔ پھر دوزخ میں اس کو جلاؤ۔ پھر ایسی زنجیر میں جو پیمائش میں ستر گز ہے اس کو داخل کرو۔ جاننا چاہیئے کہ اِن آیات میں ظاہر فرمایا کہ دُنیا کا رُوحانی عذاب عالمِ معاد میں جسمانی طور پر نمودار ہوگا۔ چنانچہ طوقِ گردن دُنیا کی خواہشوں کا جس نے انسان کے سر کو زمین کی طرف جھکا رکھا تھا وہ عالمِ ثانی میں ظاہری صورت میں نظر آجائے گا۔ اور ایسا ہی دُنیا کی گرفتاریوں کی زنجیر پیروں میں پڑی ہوئی دِکھائی دے گی۔ اور دُنیا کی خواہشوں کی سوزشوں کی آگ ظاہر ظاہر بھڑکی ہوئی نظر آئے گی ؂

فاسق انسان دُنیا کی زِندگی میں ہَوا و ہَوَس کا ایک جہنّم اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور ناکامیوں میں اس جہنّم کی سوزشوں کا احساس کرتا ہے۔ پس جبکہ اپنی فانی شہوات سے دُور ڈالا جائیگا اور ہمیشہ کی نا اُمیدی طاری ہو گی خدائے تعالیٰ ان حسرتوں کو جسمانی آگ کے طور پر اُس پر ظاہر کرے گا۔

؎ ۶۹ : ۳۱ : ۳۳ ،

جیسا کہ وہ فرماتا ہے :-

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ

یعنی ان میں اور ان کی خواہشوں کی چیزوں میں جُدائی ڈالی جائے گی۔ اور یہی عذاب کی جڑھ ہوگی ۔ اور پھر جو فرمایا کہ ستّر گز کی زنجیر میں اس کو داخل کرو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک فاسق بسا اوقات ستّر برس کی عُمر پالیتا ہے۔ بلکہ کئی دفعہ اِس دُنیا میں اس کو ایسے برس بھی ملتے ہیں کہ خورد سالی کی عُمر اور پیرِ فرتوت ہونے کی عُمر الگ کر کے پھر اِس قدر صاف اور خالص حِصّہ عُمر کا اس کو ملتا ہے جو عقلمندی اور محنت اور کام کے لائق ہوتا ہے۔ لیکن وُہ بدبخت اپنی عمدہ زِندگی کے ستّر برس دُنیا کی گرفتاریوں میں گذارتا ہے ۔ اور اس زنجیر سے آزاد ہونا نہیں چاھتا۔ سو خدائے تعالےٰ اِس آیت میں فرماتا ہے کہ وُہی ستّر برس جو اُس نے گرفتاریٔ دُنیا میں گُذارے تھے عالمِ معاد میں زنجیر کی طرح متمثّل ہو جائیں گے جو ستّر گز کی ہوگی۔ ہر ایک گز بجائے ایک سال کے ہے۔ اِس جگہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خُدائے تعالیٰ اپنی طرف سے بندہ پر کوئی مُصیبت نہیں ڈالتا۔ بلکہ وُہ انسان کے اپنے ہی بُرے کام اس کے آگے رکھ دیتا ہے ۔

پھر اپنی اسی سُنّت کے اظہار میں خُدائے تعالیٰ ایک اَور جگہ فرماتا ہے :-

---

ف ۳۴ : ۵۵ ،

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِىْ مِنَ اللَّهَبِ [1]

یعنی اَے بدکارو! گمراہو! سہ گوشہ سایہ کی طرف چلو جس کی تین شاخیں ہیں جو سایہ کا کام نہیں دے سکتیں اور نہ گرمی سے بچا سکتی ہیں اِس آیت میں تین شاخوں سے مُراد قوّتِ سبعی اور بہیمی اور وہمی ہے۔ جو لوگ ان تینوں قوّتوں کو اخلاقی رنگ میں نہیں لاتے اور اُن کی تعدیل نہیں کرتے اُن کی یہ قوّتیں قیامت میں اس طرح پر نمُودار کی جائیں گی کہ گویا تین شاخیں بغیر پتّوں کے کھڑی ہیں اور گرمی سے بچا نہیں سکتیں اور وُہ گرمی سے جلیں گے۔ پھر ایسا ہی خدائے تعالےٰ اپنی اسی سُنّت کے اظہار کے لئے بہشتیوں کے حق میں فرماتا ہے:۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ [2]

یعنی اُس روز تو دیکھے گا کہ مومنوں کا یہ نور جو دُنیا میں پوشیدہ طور پر ہے ظاہر اُن کے آگے اور اُن کی داہنی طرف دوڑتا ہوگا ✿

اور پھر ایک اَور آیت میں فرماتا ہے:۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ [3]

یعنی اُس دِن بعض مُنہ سیاہ ہو جائیں گے اور بعض سفید اور نورانی ہو جائیں گے ✿

---

[1] ۷۷: ۳۱، ۳۲۔ [2] ۵۷: ۱۳۔ [3] ۳: ۱۰۷۔

اور پھر ایک اور آیت میں فرماتا ہے :-

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۱؎

یعنی وُہ بہشت جو پرہیزگاروں کو دیا جائے گا اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک باغ ہے۔ اس میں اس پانی کی نہریں ہیں جو کبھی متعفّن نہیں ہوتا۔ اور نیز اس میں اس دُودھ کی نہریں ہیں جس کا کبھی مزہ نہیں بدلتا۔ نیز اس میں شراب کی نہریں ہیں جو سراسر سرُور بخش ہیں جس کے ساتھ خمار نہیں۔ نیز اس میں اس شہد کی نہریں ہیں جو نہایت صاف ہے جس کے ساتھ کوئی کثافت نہیں۔ اس جگہ صاف طور پر فرمایا کہ اس بہشت کو مثالی طور پر یُوں سمجھ لو کہ ان تمام چیزوں کی اس میں ناپیدا کنار نہریں ہیں وُہ زِندگی کا پانی جو عارف دُنیا میں رُوحانی طور پر پیتا ہے۔ اس میں ظاہری طور پر موجود ہے۔ اور وُہ رُوحانی دُودھ جس سے وُہ شیرخوار بچّہ کی طرح رُوحانی طور پر دُنیا میں پرورش پاتا ہے بہشت میں ظاہر ظاہر دِکھائی دے گا اور وُہ خُدا کی محبّت کی شراب جس سے وُہ دُنیا میں رُوحانی طور پر ہمیشہ مست رہتا تھا۔ اور اب بہشت میں ظاہر ظاہر اس کی نہریں نظر آئیں گی اور وُہ حلاوتِ ایمانی کا شہد جو دُنیا میں رُوحانی طور پر عارف کے مُنہ میں

۱؎ ۴۷ : ۱۶ ،

جاتا تھا وُہ بہشت میں محسوس اور نمایاں نہروں کی طرح دِکھائی دے گا۔ اور ہر ایک بہشتی اپنی نہروں اور اپنے باغوں کے ساتھ اپنی رُوحانی حالت کا اندازہ برہنہ کر کے دِکھلا دے گا۔ اور خُدا بھی اُس دِن بہشتیوں کے لئے حجابوں سے باہر آجائے گا۔ غرض رُوحانی حالتیں مخفی نہیں رہیں گی۔ بلکہ جسمانی طور پر نظر آئیں گی ؂

تیسرا دقیقہ معرفت

تیسرا دقیقہ معرفت کا یہ ہے کہ عالمِ معاد میں ترقّیات غیر متناہی ہونگی۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ؁

یعنی جو لوگ دُنیا میں ایمان کا نُور رکھتے ہیں۔ اُن کا نور قیامت کو اُن کے آگے اور اُن کے داہنی طرف دَوڑتا ہوگا۔ وُہ ہمیشہ یہی کہتے رہیں گے کہ اَے خُدا ہمارے نُور کو کمال تک پہنچا اور اپنی معرفت کے اندر ہمیں لے لے۔ تُو ہر چیز پر قادر ہے ؂

اِس آیت میں یہ جو فرمایا کہ وُہ ہمیشہ یہی کہتے رہیں گے کہ ہمارے نُور کو کمال تک پہنچا۔ یہ ترقّیاتِ غیر متناہیہ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ایک

؁ ۶۶: ۹

کمال نُورانیت کا اُنھیں حاصل ہوگا۔ پھر دُوسرا کمال نظر آئے گا۔ اُس کو دیکھ کر پہلے کمال کو ناقص پائیں گے۔ پس کمالِ ثانی کے حصُول کے لئے التجا کرینگے۔ اور جب وُہ حاصل ہوگا تو ایک تیسرا مرتبہ کمال کا اُن پر ظاہر ہوگا۔ پھر اس کو دیکھ کر پہلے کمالات کو ہیچ سمجھیں گے۔ اور اس کی خواہش کرینگے۔ یہی ترقیّات کی خواہش ہے جو اَتْمِمْ کے لفظ سے سمجھی جاتی ہے ۔

غرض اسی طرح غیر متناہی سلسلہ ترقیات کا چلا جائے گا۔ تنزّل کبھی نہیں ہوگا اور نہ کبھی بہشت سے نکالے جائیں گے بلکہ ہر روز آگے بڑھیں گے اور پیچھے نہ ہٹیں گے۔ اور یہ جو فرمایا کہ وُہ ہمیشہ اپنی مغفرت چاہیں گے۔ اسجگہ سوال یہ ہے کہ جب بہشت میں داخل ہو گئے تو پھر مغفرت میں کیا کسر رہ گئی اور جب گُناہ بخشے گئے تو پھر استغفار میں کون سی حاجت رہی ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مغفرت کے اصل معنی یہ ہیں۔ نا ملائم اور ناقص حالت کو نیچے دبانا اور ڈھانکنا۔ سو بہشتی اِس بات کی خواہش کریں کہ کمال تام حاصل کریں اور سراسر نُور میں غرق ہو جائیں۔ وُہ دُوسری حالت کو دیکھ کر پہلی حالت کو ناقص پائیں گے۔ پس چاہیں گے کہ پہلی حالت نیچے دبائی جائے۔ پھر تیسرے کمال کو دیکھ کر یہ آرزُو کرینگے کہ دُوسرے کمال کی نسبت مغفرت ہو۔ یعنی وہ حالتِ ناقصہ نیچے دبائی جائے۔ اور مخفی کی جاوے۔ اسی طرح غیر متناہی مغفرت کے خواہشمند رہیں گے۔ یہ وُہی لفظ مغفرت اور استغفار کا ہے جو بعض نادان بطورِ اعتراض ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نسبت پیش کیا کرتے ہیں۔ سو ناظرین نے اس جگہ سے سمجھ لیا ہوگا کہ یہی خواہشِ استغفار

فخرِ انسان ہے۔ جو شخص کسی عورت کے پیٹ سے پیدا ہُوا اور پھر ہمیشہ کے لئے استغفار اپنی عادت نہیں پکڑتا وُہ کیڑا ہے نہ انسان، اور اندھا ہے نہ سوجاکھا۔ اور ناپاک ہے نہ طیّب ⁂

اب خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن شریف کی رُو سے دوزخ اور بہشت دونوں اصل میں انسان کی زندگی کے اظلال اور آثار ہیں۔ کوئی ایسی نئی جسمانی چیز نہیں ہے کہ جو دوسری جگہ سے آوے۔ یہ سچ ہے کہ وہ دونوں جسمانی طور سے متمثل ہوں گے۔ مگر وُہ اصل رُوحانی حالتوں کے اظلال اور آثار ہوں گے۔ ہم لوگ ایسی بہشت کے قائل نہیں کہ صرف جسمانی طور پر ایک زمین پر درخت لگائے گئے ہوں اور نہ ایسی دوزخ کے ہم قائل ہیں جس میں درحقیقت گندھک کے پتھّر ہیں۔ بلکہ انسانی عقیدہ کے موافق بہشت دوزخ انہی اعمال کے انعکاسات ہیں جو دُنیا میں انسان کرتا ہے

تیسرا سوال

دُنیا میں انسان کی زِندگی کا اصل مُدّعا کیا ہے؟ اور وُہ کِس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ مختلف الطّبائع انسان اپنی کوتاہ فہمی یا پست ہمّتی سے مختلف طور کے مُدّعا اپنی زندگی کے لئے ٹھہراتے ہیں اور

فقط دُنیا کے مقاصد اور آرزوؤں تک چل کر آگے ٹھہر جاتے ہیں۔ مگر وہ مدعا
جو خدائے تعالیٰ اپنے پاک کلام میں بیان فرماتا ہے یہ ہے :-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ۝[1]

یعنی مَیں نے جنّ اور انسان کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وُہ مجھے پہچانیں۔ اور
میری پرستش کریں۔ پس اس آیت کی رُو سے اصل مُدّعا انسان کی زندگی کا خدا
تعالیٰ کی پرستش اور خدا تعالیٰ کی معرفت اور خدا تعالےٰ کے لئے ہوجانا ہے
یہ توظاہر ہے کہ انسان کو تو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے کہ اپنی زندگی کا مُدّعا اپنے
اختیار سے آپ مقرّر کرے۔ کیونکہ انسان نہ اپنی مرضی سے آتا ہے اور نہ اپنی
مرضی سے واپس جائے گا۔ بلکہ وُہ ایک مخلوق ہے اور جس نے پیدا کیا
اور تمام حیوانات کی نسبت عُمدہ اور اعلیٰ قویٰ اس کو عنایت کئے۔ اسی نے
اس کی زندگی کا ایک مُدّعا ٹھہرا رکھا ہے۔ خواہ کوئی انسان اس مُدّعا کو سمجھے
یا نہ سمجھے۔ مگر انسان کی پیدائش کا مُدّعا بلاشبہ خُدا کی پرستش اور خدا تعالیٰ
کی معرفت اور خُدا تعالیٰ میں فانی ہوجانا ہی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن
شریف میں ایک اَور جگہ فرماتا ہے :-

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ[2] فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ
فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ...... ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ[3]

یعنی وُہ دِین جس میں خُدا کی معرفت صحیح اور اس کی پرستش احسن طور پر ہے
وہ اسلام ہے۔ اور اسلام انسان کی فِطرت میں رکھا گیا ہے۔ اور خُدا تعالیٰ

---

[1] ۵۱ : ۵۷ ، [2] ۳ : ۲۰ ، [3] ۳۰ : ۳۱ ،

نے انسان کو اسلام پر پیدا کیا اور اسلام کے لئے پیدا کیا ہے۔ یعنی یہ چاہا ہے کہ انسان اپنے تمام قویٰ کے ساتھ اس کی پرستش، اطاعت اور محبت میں لگ جائے۔ اسی وجہ سے اس قادر کریم نے انسان کو تمام قویٰ اسلام کے مناسب حال عطا کئے ہیں ٭

اِن آیتوں کی تفصیل بہت بڑی ہے۔ اور ہم کسی قدر پہلے سوال کے تیسرے حصے میں لکھ بھی چکے ہیں۔ لیکن اب ہم مختصر طور پر صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کو جو کچھ اندرونی اور بیرونی اعضاء دِئے گئے ہیں یا جو کچھ قوتیں عنایت ہوئی ہیں، اصل مقصود اُن سے خُدا کی معرفت اور خدا کی پرستش اور خُدا تعالیٰ کی محبت ہے۔ اسی وجہ سے انسان دُنیا میں ہزاروں شغلوں کو اختیار کر کے پھر بھی بجُز خُدا تعالےٰ کے اپنی سچّی خوشحالی کسی میں نہیں پاتا۔ بڑا دولت مند ہو کر، بڑا عہدہ پاکر، بڑا تاجر بن کر بڑی بادشاہی تک پہنچ کر، بڑا فلاسفر کہلا کر آخر ان دنیوی گرفتاریوں سے بڑی حسرتوں کے ساتھ جاتا ہے۔ اور ہمیشہ دل اس کا دُنیا کے استغراق سے اس کو مُلزم کرتا رہتا ہے۔ اور اس کے مکروں اور فریبوں اور ناجائز کاموں میں کبھی اس کا کانشنس اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ ایک دانا انسان اس مسئلہ کو اِس طرح بھی سمجھ سکتا ہے کہ جس چیز کے قویٰ ایک اعلیٰ سے اعلیٰ کام کر سکتے ہیں اور پھر آگے جاکر ٹھہر جاتے ہیں وُہ اعلیٰ کام اس کی پیدائش کی علتِ غائی سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً بیل کا کام اعلےٰ سے اعلےٰ قلبہ رانی یا آبپاشی یا بار برداری ہے۔ اس سے زیادہ اس کی قُوّتوں میں

کچھ ثابت نہیں ہُوا۔ سو بَیل کی زِندگی کا مُدّعا یہی تین چیزیں ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی قوّت اس میں نہیں پائی جاتی۔ مگر جب ہم انسان کی قوتوں کو ٹٹولتے ہیں کہ ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ کون سی قُوّت ہے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ خُدائے اعلےٰ و برتر کی اس میں تلاش پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وُہ چاہتا ہے کہ خُدا کی محبّت میں ایسا گداز اور محو ہو کہ اس کا اپنا کچھ بھی نہ رہے سب خُدا کا ہو جائے۔ وُہ کھانے اور سونے وغیرہ طبعی امُور میں دُوسرے حیوانات کو اپنا شریکِ غالب رکھتا ہے۔ صنعت کاری میں بعض حیوانات اِس سے بُہت بڑھے ہُوئے ہیں۔ بلکہ شہد کی مکھّیاں بھی ہر ایک پھُول کا عطر نکال کر ایسا شہد نفیس پیدا کرتی ہیں کہ اب تک اس صنعت میں اِنسان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ پس ظاہر ہے کہ انسان کا اعلیٰ کمال خُدائے تعالےٰ کا وصال ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی کا اصل مدّعا یہی ہے کہ خُدا تعالیٰ کی طرف اس کے دِل کی کھڑکی کھُلے۔

اِنسانی زندگی کے حصُول کے وسائِل

ہاں اگر یہ سوال ہو کہ یہ مُدّعا کیونکر اور کِس طرح حاصِل ہو سکتا ہے۔ اور کِن وسائل سے انسان اس کو پا سکتا ہے۔ پس واضح ہو کہ سب سے بڑا وسیلہ جو اس مُدّعا کے پانے کے لئے شرط ہے وُہ یہ ہے کہ خُدا تعالےٰ کو صحیح طور پر پہچانا جائے اور سچّے خُدا پر ایمان لایا جائے۔ کیونکہ اگر پہلا قدم ہی غلط ہے۔ اور کوئی شخص مثلاً پرند یا چرند یا عناصر یا انسان کے بچّہ

کو خُدا بنا بیٹھا ہے تو پھر دُوسرے قدموں میں اس کے راہ راست پر چلنے کی کیا اُمید ہے۔ سچّا خدا اُس کے ڈھونڈنے والوں کو مدد دیتا ہے۔ مگر مُردہ مُردہ کو کیونکر مدد دے سکتا ہے۔ اس میں اللہ جلّ شانہٗ نے خُوب تمثیل فرمائی ہے اور وُہ یہ ہے :-

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ؎

یعنی دُعا کرنے کے لائق وُہی سچّا خُدا ہے جو ہر ایک بات پر قادر ہے اور جو لوگ اس کے سوا اوروں کو پُکارتے ہیں وہ کچھ بھی ان کو جواب نہیں دے سکتے۔ اُن کی مثال ایسی ہے کہ جیسا کوئی پانی کی طرف ہاتھ پھیلاوے کہ اَے پانی میرے مُنہ میں آجا۔ تو کیا وُہ اُس کے مُنہ میں آجائے گا۔ ہرگز نہیں۔ سو جو لوگ سچّے خُدا سے بے خبر ہیں اُن کی تمام دُعائیں باطل ہیں ۔

دُوسرا وسیلہ خدائے تعالیٰ کے اس حُسن و جمال پر اطلاع پانا ہے جو باعتبار کمالِ تام کے اس میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ حُسن ایک ایسی چیز ہے جو بالطبع دل کی طرف کھینچا جاتا ہے اور اس کے مشاہدہ سے طبعاً محبّت پیدا ہوتی ہے تو حُسنِ باری تعالیٰ اس کی وحدانیت اور اس کی

؎ ۱۳: ۱۵،

عظمت اور بزرگی اور صفات ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف نے فرمایا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝[1]

یعنی خدا اپنی ذات اور صفات اور جلال میں ایک ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ سب اس کے حاجت مند ہیں۔ ذرّہ ذرّہ اس سے زندگی پاتا ہے۔ وہ کل چیزوں کے لئے مبداءِ فیض ہے اور آپ کسی سے فیضیاب نہیں۔ وہ نہ کسی کا بیٹا ہے نہ کسی کا باپ، اور کیونکر ہو کہ اس کا کوئی ہم ذات نہیں۔ قرآن نے بار بار خدا کا کمال پیش کرکے اور اس کی عظمت دکھلا کے لوگوں کو توجہ دلائی ہے کہ دیکھو ایسا خدا دلوں کا مرغوب ہے نہ کہ مُردہ اور کمزور اور کم رحم اور قدرت ❊

تیسرا وسیلہ جو مقصودِ حقیقی تک پہنچنے کے لئے دُوسرے درجہ کا زینہ ہے خُدا تعالیٰ کے احسان پر اطلاع پانا ہے۔ کیونکہ محبت کی محرّک دو ہی چیزیں ہیں حُسن یا احسان۔ اور خدائے تعالیٰ کی احسانی صفات کا خلاصہ سُورۂ فاتحہ میں پایا جاتا ہے جیسا کہ وُہ فرماتا ہے :-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝

کیونکہ ظاہر ہے کہ احسان کامل اس میں ہے کہ خُدائے تعالیٰ اپنے بندوں کو محض نابود سے پیدا کرے اور پھر ہمیشہ اس کی رُبوبیّت اُنکے شاملِ حال

---

[1] ۱۱۲ : ۲، ۶۔

ہو اور وہی ہر ایک چیز کا آپ سہارا ہو۔ اور اس کی تمام قسم کی رحمتیں اسکے بندوں کے لئے ظہور میں آئی ہوں اور اس کا احسان بے انتہا ہو جس کا کوئی شمار نہ کر سکے۔ سو ایسے احسانوں کو خدائے تعالےٰ نے بار بار جتلایا ہے۔ جیسا کہ ایک اور جگہ فرماتا ہے :۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا[۱]

یعنی اگر خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ہرگز نہ گن سکو گے۔

چوتھا وسیلہ خدائے تعالےٰ نے اصل مقصود کو پانے کے لئے **دعا** کو ٹھہرایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے :۔

اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[۲]

یعنی تم دعا کرو میں قبول کروں گا۔ اور بار بار دعا کے لئے رغبت دلائی ہے، تا انسان اپنی طاقت سے نہیں بلکہ خدا کی طاقت سے پاوے۔

پانچواں وسیلہ اصل مقصود کے پانے کے لئے خدا تعالیٰ نے مجاہدہ ٹھہرایا ہے۔ یعنی اپنا مال خدائے تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی طاقتوں کو خدا تعالےٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی جانوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی عقل کو خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اس کو ڈھونڈا جائے جیسا کہ وہ فرماتا ہے :۔

جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[۳]

---

[۱] ۱۴ : ۳۵ ، [۲] ۴۰ : ۶۱ ، [۳] ۹ : ۴۲ ،

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[1]۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[2]

یعنی اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور اپنے نفسوں کو مع ان کی تمام طاقتوں کے خُدا کی راہ میں خرچ کرو۔ اور جو کچھ ہم نے عقل اور علم اور فہم اور ہُنر وغیرہ تم کو دِیا ہے[3] وہ سب کچھ خُدا کی راہ میں لگاؤ۔ جو لوگ ہماری راہ میں ہر ایک طور سے کوشش بجا لاتے ہیں ہم اُن کو اپنی راہیں دِکھا دِیا کرتے ہیں ؂

چھٹا وسیلہ اصل مقصود کے پانے کے لئے استقامت کو بیان فرمایا ہے۔ یعنی اس راہ میں درماندہ اور عاجز نہ ہو اور تھک نہ جائے۔ اور امتحان سے ڈر نہ جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ[4]

یعنی وُہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے اور باطل خُداؤں سے الگ ہو گئے پھر استقامت اختیار کی۔ یعنی طرح طرح کی آزمائشوں اور بَلا کے وقت ثابت قدم رہے۔ اُن پر فرشتے اُترتے ہیں کہ تم مت ڈرو۔ اور

---

[1] ۲ : ۴ ، [2] ۲۹ : ۷۰ ، [3] دُوسری آیت وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ (۶۳ : ۱۱) ہے۔ شمس
[4] ۴۱ : ۳۱ ،

مت غمگین ہو اور خوش ہو اور خوشی میں بھر جاؤ کہ تم اس خوشی کے وارث
ہو گئے جس کا تمھیں وعدہ دِیا گیا ہے۔ ہم اس دُنیوی زِندگی میں اور آخرت
میں تمھارے دوست ہیں۔ اِس جگہ اِن کلمات سے یہ اشارہ فرمایا کہ اس استقامت
سے خُدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ یہ سچ بات ہے کہ استقامت فوق الکرامت
ہے۔ کمال استقامت یہ ہے کہ چاروں طرف بلاؤں کو محیط دیکھیں اور خُدا کی
راہ میں جان اور عزّت اور آبرو کو معرضِ خطر میں پاویں اور کوئی تسلّی دینے
والی بات موجود نہ ہو۔ یہاں تک کہ خُدا تعالےٰ بھی امتحان کے طور پر تسلّی
دینے والے کشف یا خواب یا الہام کو بند کر دے اور ہولناک خوفوں میں
چھوڑ دے۔ اس وقت نامردی نہ دِکھلاویں اور بُزدلوں کی طرح پیچھے نہ
ہٹیں اور وفاداری کی صفت میں کوئی خلل پیدا نہ کریں۔ صِدق اور ثبات میں
کوئی رخنہ نہ ڈالیں۔ ذِلّت پر خوش ہو جائیں۔ موت پر راضی ہو جائیں اور
ثابت قدمی کے لئے کسی دوست کا انتظار نہ کریں کہ وُہ سہارا دے۔ نہ اس
وقت خُدا کی بشارتوں کے طالب ہوں کہ وقت نازک ہے۔ اور باوجود
سراسر بےکس اور کمزور ہونے کے اور کسی تسلّی کے نہ پانے کے سِیدھے
کھڑے ہو جائیں۔ اور ہرچہ بادا باد کہہ کر گردن کو آگے رکھ دیں اور قضاء و
قدر کے آگے دم نہ ماریں اور ہرگز بےقراری اور جزع فزع نہ دِکھلاویں
جب تک کہ آزمائش کا حق پُورا ہو جائے۔ یہی استقامت ہے جس سے خُدا
مِلتا ہے۔ یہی وُہ چیز ہے جس کی رسُولوں اور نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں
کی خاک سے اب تک خُوشبو آ رہی ہے۔ اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ

اِس دُعا میں ارشاد فرماتا ہے :۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝

یعنی اے ہمارے خدا تعالےٰ ! ہمیں استقامت کی راہ دِکھلا ۔ وُہی راہ جس پر تیرا انعام واکرام مترتب ہوتا ہے اور تُو راضی ہوجاتا ہے اور اسی کی طرف اس دُوسری آیت میں اشارہ فرمایا :۔

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ[1]

اے خُدا ! اِس مصیبت میں ہمارے دل پر وُہ سکینت نازل کر جس سے صبر آجائے ۔ اور ایسا کر کہ ہماری موت اسلام پر ہو۔ جاننا چاہیئے کہ دُکھوں اور مُصیبتوں کے وقت میں خُدا تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کے دِل پر ایک نُور اُتارتا ہے ۔جس سے وُہ قُوّت پاکر نہایت اطمینان سے مصیبت کا مقابلہ کرتے ہیں اور حلاوتِ ایمانی سے ان زنجیروں کو بوسہ دیتے ہیں جو اس کی راہ میں ان کے پیروں میں پڑیں ۔جب باخُدا آدمی پر بلائیں نازل ہوتی ہیں اور موت کے آثار ظاہر ہوجاتے ہیں تو وُہ اپنے ربِّ کریم سے خواہ نخواہ کا جھگڑا شرُوع نہیں کرتا کہ مجھُے اِن بلاؤں سے بچا ۔کیونکہ اس وقت عافیت کی دُعا میں اصرار کرنا خُدا تعالیٰ سے لڑائی اور موافقتِ تامہ کے مخالف ہے بلکہ سچّا محبّ بَلا کے اُترنے سے اور آگے قدم رکھتا ہے ۔اور ایسے وقت میں جان کو ناچیز سمجھ کر اور جان کی محبّت کو الوداع کہکر اپنے مولیٰ کی مرضی

---

[1] ۷ : ۱۲۷ ،

کا بکلّی تابع ہوجاتا ہے اور اس کی رضا چاہتا ہے۔ اسی کے حق میں اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۝[1]

یعنی خدا کا پیارا بندہ اپنی جان خدا کی راہ میں دیتا ہے اور اس کے عوض میں خدا تعالیٰ کی مرضی خرید لیتا ہے۔ وہی لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کی رحمتِ خاص کے مورد ہیں۔ غرض وہ استقامت جس سے خدا ملتا ہے اس کی یہی رُوح ہے جو بیان کی گئی جس کو سمجھنا ہو سمجھ لے ٭

ساتواں وسیلہ اصل مقصود کے پانے کے لئے راستبازوں کی صحبت اور اُن کے کامل نمونوں کو دیکھنا ہے۔ پس جاننا چاہیئے کہ انبیاء کی ضرورتوں میں سے ایک یہ بھی ضرورت ہے کہ انسان طبعًا کامل نمونہ کا محتاج ہے اور کامل نمونہ شوق کو زیادہ کرتا ہے اور ہمّت کو بڑھاتا ہے۔ اور جو نمونے کا پیرو نہیں وُہ سست ہو جاتا ہے اور بہک جاتا ہے۔ اسی کی طرف اللہ جلّشانہٗ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے:۔

كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ[2]

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ[3]

یعنی تم اُن لوگوں کی صحبت اختیار کرو جو راست باز ہیں۔ اُن لوگوں کی راہیں سیکھو جن پر تم سے پہلے فضل ہو چکا ہے ٭

---

[1] ۲ : ۲۰۸ ، [2] ۹ : ۱۲۰ ، [3] ۱ : ۷ ،

آٹھواں وسیلہ خُدائے تعالیٰ کی طرف سے پاک کشف اور پاک الہام اور پاک خوابیں ہیں۔ چونکہ خُدائے تعالیٰ کی طرف سفر کرنا ایک نہایت دقیق در دقیق راہ ہے۔ اور اس کے ساتھ طرح طرح کے مصائب اور دُکھ لگے ہوئے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ انسان اس نادیدہ راہ میں بھول جائے۔ یا نا اُمیدی طاری ہو۔ اور آگے قدم بڑھانا چھوڑ دے۔ اِس لئے خُدا تعالیٰ کی رحمت نے چاہا کہ اپنی طرف سے اس سفر میں ساتھ ساتھ اُس کو تسلی دیتی رہے۔ اور اس کی دِل دہی کرتی رہے۔ اور اس کی کمرِ ہمّت باندھتی رہے۔ اور اس کے شوق کو زیادہ کرے۔ سو اس کی سُنّت اِس راہ کے مسافروں کے ساتھ اس طرح پر واقع ہے کہ وُہ وقتاً فوقتاً اپنے کلام اور اپنے الہام سے اِن کو تسلی دیتا اور اُن پر ظاہر کرتا ہے کہ مَیں تُمہارے ساتھ ہُوں۔ تب وُہ قوّت پاکر بڑے زور سے اس سفر کو طے کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں وُہ فرماتا ہے :۔

لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ [1]

اِسی طرح اَور بھی کئی وسائل ہیں جو قرآن شریف نے بیان فرمائے ہیں۔ مگر افسوس ہم اندیشۂ طول کی وجہ سے اُن کو بیان نہیں کر سکتے ؂

---

[1] ۱۰ : ۶۵ ،

چوتھا سوال

کرم یعنی اعمال کا اثر دُنیا اور عاقبت میں کیا ہوتا ہے؟

اس سوال کا جواب وُہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خدا تعالےٰ کی سچّی اور کامل شریعت کا فعل جو اس کی زندگی میں انسان کے دِل پر ہوتا ہے وُہ یہ ہے کہ اس کو وحشیانہ حالت سے انسان بنادے۔ پھر انسان سے با اخلاق انسان بنادے۔ اور پھر با اخلاق انسان سے باخُدا انسان بنا دے۔ اور نیز اس زندگی میں عملی شریعت کا ایک فعل یہ ہے کہ شریعتِ حقّہ پر قائم ہو جانے سے ایسے شخص کا بنی نوع پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وُہ درجہ بدرجہ اُن کے حقوق کو پہچانتا ہے۔ اور عدل اور احسان اور ہمدردی کی قوتوں کو اپنے اپنے محل پر استعمال کرتا ہے۔ اور جو کچھ خُدا نے اُس کو علم اور معرفت اور مال اور آسائش میں سے حصّہ دِیا ہے۔ سب لوگوں کو حسبِ مراتب اُن نعمتوں میں شریک کر دیتا ہے۔ وُہ تمام بنی نوع پر سُورج کی طرح اپنی تمام روشنی ڈالتا ہے۔ اور چاند کی طرح حضرت اعلیٰ سے نور پاکر وُہ نور دُوسروں تک پہنچاتا ہے۔ وُہ دِن کی طرح روشن ہو کر نیکی اور بھلائی کی راہیں لوگوں کو دِکھاتا ہے اور وُہ رات کی طرح ہر ایک ضعیف کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اور تھکوں اور ماندوں کو آرام پہنچاتا ہے۔ وُہ آسمان کی طرح ہر ایک حاجت مند کو اپنے سایہ کے نیچے جگہ دیتا ہے۔ اور وقتوں پر اپنے فیض کی بارشیں برساتا ہے۔

وُہ زمین کی طرح کمال انکسار سے ہر ایک آدمی کی آسائش کے لئے بطور فرش کے ہو جاتا اور سب کو اپنی کنارِ عاطفت میں لے لیتا اور طرح طرح کے رُوحانی میوے اُن کے لئے پیش کرتا ہے۔ سو یہی کامل شریعت کا اثر ہے کہ کامل شریعت پر قائم ہونے والا حق اللہ اور حق العباد کو کمال کے نُقطہ تک پہنچا دیتا ہے۔ خُدا میں وُہ محو ہو جاتا ہے اور مخلُوق کا سچّا خادم بن جاتا ہے۔ یہ تو عملی شریعت کا اس زندگی میں اس پر اثر ہے۔ مگر زندگی کے بعد جو اثر ہے وُہ یہ ہے کہ خُدا کا رُوحانی اتصال اس روز کھُلے کھُلے دیدار کے طور پر اس کو نظر آئے گا۔ اور خلق اللہ کی خدمت جو اُس نے خُدا کی محبّت میں ہو کر کی۔ جس کا محرّک ایمان اور اعمالِ صالحہ کی خواہش تھی۔ وُہ بہشت کے درختوں اور نہروں کی طرح متمثل ہو کر دِکھائی دے گی۔ اس میں خُدائے تعالےٰ کا فرمان یہ ہے :۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ○ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ○ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ○ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ○ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ○ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ○ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ ○ اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰهَا ○ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ○ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا ○ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ○ (۹۱: ۲-۱۶)

یعنی قسم ہے سُورج کی اور اس کی روشنی کی۔ اور قسم ہے چاند کی جب پیروی کرے سُورج کی۔ یعنی سورج سے نور حاصل کرے۔ اور پھر سُورج کی طرح اس نُور کو دُوسروں تک پہنچادے۔ اور قسم ہے دِن کی جب سُورج کی صفائی دِکھادے اور راہوں کو نمایاں کرے۔ اور قسم ہے رات کی جب اندھیرا کرے اور اپنے پردۂ تاریکی میں سب کو لے لے۔ اور قسم ہے آسمان کی اور اس علّتِ غائی کی جو آسمان کی اس بناء کا مُوجب ہُوئی۔ اور قسم ہے زمین کی اور اُس علّتِ غائی کی جو زمین کے اس قسم کے فرش کا موجب ہوئی اور قسم ہے نفس کی اور نفس کے اس کمال کی جس نے ان سب چیزوں کے ساتھ اس کو برابر کر دیا۔ یعنی وُہ کمالات جو متفرّق طور پر ان چیزوں میں پائے جاتے ہیں کامل انسان کا نفس ان سب کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے اور جیسے یہ تمام چیزیں علیحدہ علیحدہ نوعِ انسان کی خدمت کر رہی ہیں کامل انسان ان تمام خدمات کو اکیلا بجا لاتا ہے جیسا کہ میَں ابھی لِکھ چُکا ہُوں۔ اور پھر فرماتا ہے کہ وُہ شخص نجات پاگیا اور موت سے بچ گیا جس نے اِس طرح پر نفس کو پاک کیا۔ یعنی سُورج اور چاند اور زمین وغیرہ کی طرح خدُا میں محو ہوکر خلق اللہ کا خادم بنا ٭

یاد رہے کہ حیات سے مُراد حیاتِ جاودانی ہے جو آئندہ کامل انسان کو حاصل ہوگی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عملی شریعت کا پھل آئندہ زندگی میں حیاتِ جاودانی ہے۔ جو خدُا کے دِیدار کی غذا سے ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور پھر فرمایا کہ وُہ شخص ہلاک ہوگیا اور زندگی سے نامید ہوگیا

جس نے اپنے نفس کو خاک میں ملا دیا اور جن کمالات کی اس کو استعدادیں دی گئی تھیں اُن کمالات کو حاصل نہ کیا اور گندی زندگی بسر کر کے واپس گیا۔ اور پھر مثال کے طور پر فرمایا کہ ثمود کا قصہ اُس بدبخت کے قصہ سے مشابہ ہے۔ انھوں نے اُس اونٹنی کو زخمی کیا جو خدا کی اونٹنی کہلاتی تھی۔ اور اپنے چشمہ سے پانی پینے سے اس کو روکا۔ سو اس شخص نے درحقیقت خدا کی اونٹنی کو زخمی کیا اور اس کو اس چشمہ سے محروم رکھا۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا نفس خدا کی اونٹنی ہے جس پر وہ سوار ہوتا ہے۔ یعنی انسان کا دِل الٰہی تجلّیات کی جگہ ہے اور اس اونٹنی کا پانی خدا کی محبّت اور معرفت ہے جس سے وہ جیتی ہے۔ اور پھر فرمایا کہ ثمود نے جب اونٹنی کو زخمی کیا۔ اور اس کو اس کے پانی سے روکا تو ان پر عذاب نازل ہوا اور خدا تعالیٰ نے اِس بات کی کچھ بھی پرواہ نہ کی کہ ان کے مرنے کے بعد اُن کے بچّوں اور بیواؤں کا کیا حال ہوگا۔ سو ایسا ہی جو شخص اس اونٹنی یعنی نفس کو زخمی کرتا ہے اور اس کو کمال تک پہنچانا نہیں چاہتا اور پانی پینے سے روکتا ہے وہ بھی ہلاک ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے مختلف اشیاء کی قسم کھانے میں حکمت

اِس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ خدا کا سورج اور چاند وغیرہ کی قسم کھانا ایک نہایت دقیق حکمت پر مشتمل ہے۔ جس سے ہمارے اکثر مخالف ناواقف

ہونے کی وجہ سے اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ خدا کو قسموں کی کیا ضرورت پڑی اور
اُس نے مخلوق کی کیوں قسمیں کھائیں۔ لیکن چونکہ ان کی سمجھ زمینی ہے نہ آسمانی
اِس لئے وُہ معارف حقّہ کو سمجھ نہیں سکتے۔ سو واضح ہو کہ قسم کھانے سے اصل مدعا
یہ ہوتا ہے کہ قسم کھانے والا اپنے دعوے کے لئے ایک گواہی پیش کرنا
چاھتا ہے۔ کیونکہ جس دعوے پر اَور کوئی گواہ نہیں ہوتا۔ وُہ بجائے گواہ کے
خدا تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے۔ اِس لئے کہ خُدا عالم الغیب ہے۔ اور ہر ایک
مقدّمہ میں وُہ پہلا گواہ ہے۔ گویا وُہ خُدا کی گواہی اِس طرح پیش کرتا ہے کہ
اگر خُدا تعالیٰ اِس قسم کے بعد خاموش رہا اور اس پر عذاب نازل نہ کیا تو
گویا اس نے اس شخص کے بیان پر گواہوں کی طرح مُہر لگا دی۔ اسلئے مخلوق کو
نہیں چاہیئے کہ دُوسری مخلُوق کی قسم کھاوے۔ کیونکہ مخلُوق عالم الغیب نہیں۔ اور
نہ جھُوٹی قسم پر سزا دینے پر قادر ہے۔ مگر خُدا کی قسم ان آیات میں ان معنوں
سے نہیں جیساکہ مخلُوق کی قسم میں مُراد لی جاتی ہے۔ بلکہ اس میں یہ سُنّت اللہ
ہے کہ خُدا کے دو قسم کے کام ہیں، ایک بدیہی جو سب کی سمجھ میں آسکتے
ہیں اور ان میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اور دُوسرے وُہ کام جو نظری ہیں۔ جن
میں دُنیا غلطیاں کھاتی ہے اور باہم اختلاف رکھتی ہے۔ سو خُدا تعالیٰ نے
نے چاہا کہ بدیہی کاموں کی شہادت سے نظری کاموں کو لوگوں کی نظر میں
ثابت کرے ؀

پس یہ تو ظاہر ہے کہ سُورج اور چاند اور دن اور رات اور آسمان
اور زمین میں وُہ خواص درحقیقت پائے جاتے ہیں جن کو ہم ذِکر کر چکے ہیں

مگر جو اِس قسم کے خواص انسان کے نفسِ ناطقہ میں موجود ہیں اُن سے ہر ایک شخص آگاہ نہیں۔ سو خُدا نے اپنے بدیہی کاموں کو نظری کاموں کے کھولنے کے لئے بطور گواہ کے پیش کیا ہے۔ گویا وُہ فرماتا ہے کہ اگر تم ان خواص سے شک میں ہو جو نفسِ ناطقۂ انسانی میں پائے جاتے ہیں تو چاند اور سُورج وغیرہ میں غور کرو کہ ان میں بدیہی طور پر یہ خواص موجود ہیں اور تم جانتے ہو کہ انسان ایک عالمِ صغیر ہے جس کے نفس میں تمام عالم کا نقشہ اجمالی طور پر مرکوز ہے۔ پھر جب یہ ثابت ہے کہ عالمِ کبیر کے بڑے بڑے اجرام یہ خواص اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح پر مخلوقات کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ تو انسان جو ان سب سے بڑا کہلاتا ہے اور بڑے درجہ کا پَیدا کیا گیا ہے وُہ کیونکر ان خواص سے خالی اور بے نصیب ہو گا۔ نہیں، بلکہ اس میں بھی سُورج کی طرح ایک علمی اور عقلی روشنی ہے جس کے ذریعہ سے وُہ تمام دُنیا کو منوّر کر سکتا ہے۔ اور چاند کی طرح وہ حضرت اعلیٰ سے کشف اور الہام اور وحی کا نُور پاتا ہے اور دُوسروں تک جنھوں نے انسانی کمال ابھی تک حاصل نہیں کیا اس نور کو پہنچاتا ہے۔ پھر کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ نبوّت باطل ہے۔ اور تمام رسالتیں اور شریعتیں اور کتابیں انسان کی مکاری اور خود غرضی ہے۔ یہ بھی دیکھتے ہو۔ کہ کیونکر دن کے روشن ہونے سے تمام راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔ تمام نشیب و فراز نظر آجاتے ہیں۔ سو کامل انسان رُوحانی روشنی کا دِن ہے۔ اس کے چڑھنے سے ہر ایک راہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ وُہ سچّی راہ کو دِکھلا دیتا ہے کہ کہاں اور کِدھر ہے۔ کیونکہ راستی اور سچّائی کا وُہی

روزِ روشن ہے۔ ایسا ہی یہ بھی مشاہدہ کر رہے ہو کہ رات کیسی تھکوں ماندوں کو جگہ دیتی ہے۔ تمام دِن کے شکستہ کوفتہ مزدُور رات کے کنارِ عاطفت میں بخوشی سوتے ہیں اور محنتوں سے آرام پاتے ہیں اور رات ہر ایک کے لئے پردہ پوش بھی ہے۔ ایسا ہی خُدا کے کامل بندے دُنیا کو آرام دینے کیلئے آتے ہیں۔ خُدا سے وحی اور الہام پانے والے تمام عقلمندوں کو جانکاہی سے آرام دیتے ہیں۔ انکی طفیل سے بڑے بڑے معارف آسانی کے ساتھ حل ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی خُدا کی وحی انسانی عقل کی پردہ پوشی کرتی ہے جیسا کہ رات پردہ پوشی کرتی ہے۔ اسکی ناپاک خطاؤں کو دُنیا پر ظاہر ہونے نہیں دیتی۔ کیونکہ عقلمند وحی کی روشنی کو پاکر اندر ہی اندر اپنی غلطیوں کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ اور خُدا کے پاک الہام کی برکت سے اپنے تئیں پردہ دری سے بچا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون کی طرح اسلام کے کسی فلاسفر نے کسی بُت پر مُرغ کی قربانی نہ چڑھائی۔ چونکہ افلاطُون الہام کی روشنی سے بے نصیب تھا۔ اِس لئے دھوکا کھا گیا اور ایسا فلاسفر کہلا کر یہ مکرُوہ اور احمقانہ حرکت اس سے صادر ہُوئی۔ مگر اسلام کے حکماء کو ایسے ناپاک اور احمقانہ حرکتوں سے ہمارے سیّد و مولیٰ رسول اللہ صلّی اللہُ علیہ وآلہٖ وسلّم کی پیروی نے بچا لیا۔ اب دیکھو کیسا ثابت ہُوا کہ الہام عقلمندوں کا رات کی طرح پردہ پوش ہے ؁

یہ بھی آپ لوگ جانتے ہیں کہ خُدا کے کامل بندے آسمان کی طرح ہر ایک درماندہ کو اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں۔ خاص کر اس ذاتِ پاک کے انبیاء اور الہام پانے والے عام طور پر آسمان کی طرح فیض کی بارشیں

برساتے ہیں ۔ ایسا ہی زمین کی خاصیّت بھی اپنے اندر رکھتے ہیں ۔ اُن کے نفسِ نفیس سے طرح طرح کے علومِ عالیہ کے درخت نکلتے ہیں ۔ جن کے سایہ اور پھل اور پھُول سے لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ سو یہ کھلا کھُلا قانونِ قدرت جو ہماری نظر کے سامنے ہے اسی چھُپے ہوُئے قانوُن کا ایک گواہ ہے جس کی گواہی کو ۲ دو قسموں کے پیرایہ میں خدُا تعالےٰ نے ان آیات میں پیش کیا ہے ۔ سو دیکھو کہ یہ کس قدر پُر حکمت کلام ہے جو قرآنِ شریف میں پایا جاتا ہے اس کے مُنہ سے نکلا ہے جو ایک اُمّی اور بیابان کا رہنے والا تھا ۔ اگر یہ خدُا کا کلام نہ ہوتا تو اس طرح عام عقلیں اور وُہ تمام لوگ جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اس کے اس دقیق نکتۂ معرفت سے عاجز آ کر اعتراض کی صوُرت میں اس کو نہ دیکھتے ۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ انسان جب ایک بات کو کسی پہلوُ سے بھی اپنی مختصر عقل کے ساتھ نہیں سمجھ سکتا تب ایک حِکمت کی بات کو جائے اعتراض ٹھہرا لیتا ہے ۔ اور اس کا اعتراض اِس بات کا گواہ ہو جاتا ہے کہ وُہ دقیقۂ حکمت عام عقلوں سے برتر و اعلیٰ تھا ۔ تب ہی تو عقلمندوں نے عقلمند کہلا کر پھر بھی اس پر اعتراض کر دیا ۔ مگر اب جو یہ راز کھُل گیا ۔ تو اب اس کے بعد کوئی عقل مند اس پر اعتراض نہیں کریگا بلکہ اس سے لذّت اُٹھائے گا ؂

یاد رہے کہ قرآنِ شریف نے وحی اور الہام کی سُنّتِ قدیمہ پر قانونِ قدرت سے گواہی لانے کے لِئے ایک اَور مقام میں بھی اِسی قِسم کی قسم کھائی ہے اور وُہ یہ ہے :۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ○ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ○
اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ○ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ○[1]

یعنی اُس آسمان کی قسم ہے جس کی طرف سے بارش آتی ہے۔ اور اُس زمین کی قسم ہے جو بارش سے طرح طرح کی سبزیاں نکالتی ہے کہ یہ قرآن خدا کا کلام ہے اور اُس کی وحی ہے۔ اور وُہ باطل اور حق میں فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور عبث اور بیہُودہ نہیں۔ یعنی بے وقت نہیں آیا۔ موسم کے مینہ کی طرح آیا ہے ؂

اب خدا تعالےٰ نے قرآن شریف کے ثبوت کے لئے جو اسکی وحی ہے ایک کھُلے کھُلے قانونِ قدرت کو قسم کے رنگ میں پیش کیا۔ یعنی قانونِ قدُرت میں ہمیشہ یہ بات مشہود اور مرئی ہے کہ ضرورتوں کے وقت آسمان سے بارش ہوتی ہے۔ اور تمام مدار زمین کی سرسبزی کا آسمان کی بارش پر ہے۔ اگر آسمان سے بارش نہ ہو تو رفتہ رفتہ کنُویں بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ پس در اصل زمین کے پانی کا وجُود بھی آسمان کی بارش پر موقوف ہے۔ اِسی وجہ سے جب کبھی آسمان سے پانی برستا ہے تو زمین کے کنوؤں کا پانی چڑھ آتا ہے۔ کیوں چڑھ آتا ہے؟ اس کا یہی سبب ہے کہ آسمانی پانی زمینی پانی کو اوپر کی طرف کھینچتا ہے۔ یہی رشتہ وحی اللہ اور عقل میں ہے۔ وحی اللہ یعنی الہام الٰہی آسمانی پانی ہے اور عقل زمینی پانی ہے۔ اور یہ پانی ہمیشہ آسمانی پانی سے جو الہام ہے تربیت پاتا ہے۔ اور اگر آسمانی

---

[1] ۸۶ : ۱۲ - ۱۵ ؛

پانی یعنی وحی ہونا بند ہو جائے تو یہ زمینی پانی بھی رفتہ رفتہ خشک ہو جاتا ہے۔ کیا اس کے واسطے یہ دلیل کافی نہیں کہ جب ایک زمانہ دراز گذر جاتا ہے۔ اور کوئی الہام یافتہ زمین پر پیدا نہیں ہوتا تو عقلمندوں کی عقلیں نہایت گندی اور خراب ہو جاتی ہیں۔ جیسے زمینی پانی خشک ہو جاتا اور سڑ جاتا ہے۔ اس کے سمجھنے کے لیئے اس زمانہ پر ایک نظر ڈالنا کافی ہے۔ جو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلّم کے تشریف لانے سے پہلے اپنا رنگ تمام دُنیا میں دکھلا رہا تھا۔ چونکہ اُس وقت حضرت مسیحؑ کے زمانہ کو چھ سَو برس گُذر گئے تھے۔ اور اس عرصہ میں کوئی الہام یافتہ پیدا نہیں ہوُا تھا۔ اس لئے تمام دُنیا نے اپنی حالت کو خراب کر دیا تھا۔ ہر ایک مُلک کی تاریخیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں مگر آپ کے ظہوُر سے پہلے تمام دُنیا میں خیالاتِ فاسدہ پھیل گئے تھے۔ اَیسا کیوں ہُوُا تھا اور اس کا کیا سبب تھا؟ یہی تو تھا کہ الہام کا سلسلہ مُدّتوں تک بند ہو گیا تھا۔ آسمانی سلطنت صرف عقل کے ہاتھ میں تھی۔ پس اس ناقص عقل نے کِن کِن خرابیوں میں لوگوں کو ڈالا۔ کیا اس سے کوئی ناواقف بھی ہے۔ دیکھو الہام کا پانی جب مُدّت تک نہ برسا تو تمام عقلوں کا پانی کیسا خشک ہو گیا۔

سو ان قسموں میں یہی قانونِ قُدرت اللہ تعالیٰ پیش کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ تم غور کر کے دیکھو کہ کیا خُدا کا یہ محکم اور دائمی قانونِ قُدرت نہیں کہ زمین کی تمام سرسبزی کا مدار آسمان کا پانی ہے۔ سو اِس پوشیدہ قانونِ

قدرت کے لئے جو الہامِ الٰہی کا سلسلہ ہے یہ کھلا کھلا قانونِ قدرت بطور گواہ کے ہے۔ سو اس گواہ سے فائدہ اُٹھاؤ اور صرف عقل کو اپنا رہبر مت بناؤ کہ وہ ایسا پانی نہیں جو آسمانی پانی کے سوا موجود رہ سکے جس طرح آسمانی پانی کا یہ خاصہ ہے کہ خواہ کسی کنوئیں میں اس کا پانی پڑے یا نہ پڑے وہ اپنی طبعی خاصیت سے تمام کنوؤں کے پانی کو اوپر چڑھا دیتا ہے۔ ایسا ہی جب خدا کا ایک الہام یافتہ دُنیا میں ظہور فرماتا ہے۔ خواہ کوئی عقل مند اس کی پیروی کرے یا نہ کرے۔ مگر اس الہام یافتہ کے زمانہ میں خود عقلوں میں ایسی روشنی اور صفائی آجاتی ہے۔ کہ پہلے اس سے موجود نہ تھی۔ لوگ خواہ نخواہ حق کی تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور غیب سے ایک حرکت اُن کی قوّتِ متفکّرہ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ سو یہ تمام عقلی ترقّی اور دِلی جوش اس الہام یافتہ کے قدم مبارک سے پیدا ہو جاتا ہے اور بالخاصیت زمین کے پانیوں کو اُوپر اُٹھاتا ہے۔ جب تم دیکھو کہ مذاہب کی جُستجو میں ہر ایک شخص کھڑا ہو گیا ہے اور زمینی پانی کو کچھ اُبال آیا ہے تو اُٹھو اور خبردار ہو جاؤ اور یقیناً سمجھو کہ آسمان سے زور کا مینہ برسا ہے اور کسی دِل پر الہامی بارش ہو گئی ہے ؀

پانچواں سوال

علم یعنی گیان و معرفت کے ذرائع اور وسیلے کیا کیا ہیں؟

اس سوال کے جواب میں واضح ہو کہ اس بارے میں جس قدر قرآن شریف نے مبسوط طور پر ذکر فرمایا ہے اس کے ذکر کرنے کی تو اس جگہ کسی طرح گنجائش نہیں۔ لیکن بطور نمونہ کسی قدر بیان کیا جاتا ہے۔ سو جاننا چاہئے کہ قرآن شریف نے علم تین قسم پر قرار دیا ہے۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔ جیسا کہ ہم پہلے اس سے سورۂ اَلۡھٰکُمُ التَّکَاثُرُ کی تفسیر میں ذکر کر چکے ہیں اور بیان کر چکے ہیں کہ علم الیقین وہ ہے کہ شئے مقصود کا کسی واسطہ کے ذریعہ سے نہ بلا واسطہ پتہ لگایا جاوے۔ جیسا کہ ہم دھوئیں سے آگ کے وجود پر استدلال کرتے ہیں پر آگ کو دیکھا نہیں مگر دھوئیں کو دیکھا ہے کہ جس سے ہمیں آگ کے وجود پر یقین آیا۔ سو یہ علم الیقین ہے۔ اور اگر ہم نے آگ کو ہی دیکھ لیا ہے تو یہ بموجب بیان قرآن شریف یعنی سورۂ اَلۡھٰکُمُ التَّکَاثُرُ کے علم کے مراتب میں سے عین الیقین کے نام سے موسوم ہے اور اگر ہم اس آگ میں داخل بھی ہو گئے ہیں تو اس علم کے مرتبہ کا نام قرآن شریف کے بیان کی رو سے حق الیقین ہے۔ سورۂ اَلۡھٰکُمُ التَّکَاثُرُ کے اب دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین اس موقع سے اس تفسیر کو دیکھ لیں۔

اب جاننا چاہیئے کہ پہلی قسم کا جو علم ہے یعنی علم الیقین۔ اس کا ذریعہ عقل اور منقولات ہیں۔ اللہ تعالےٰ دوزخیوں سے حکایت کر کے فرماتا ہے :-

قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِىْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝[1]

یعنی دوزخی کہیں گے کہ اگر ہم عقل مند ہوتے اور مذہب اور عقیدہ کو معقول طریقوں سے آزماتے یا کامل عقلمندوں اور محققوں کی تحریروں اور تقریروں کو توجہ سے سُنتے تو آج دوزخ میں نہ پڑتے۔ یہ آیت اِس دُوسری آیت کے موافق ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا[2]

یعنی خُدائے تعالیٰ انسانی نفُوس کو اُن کی وسعتِ علمی سے زیادہ کسی بات کو قبُول کرنے کے لئے تکلیف نہیں دیتا اور وُہی عقیدے پیش کرتا ہے جن کا سمجھنا اِنسان کی حدِ استعداد میں داخل ہے۔ تا اس کے حکم تکلیف مالا یطاق میں داخل نہ ہوں۔ اور ان آیات میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کانوں کے ذریعہ سے بھی علم الیقین حاصل کر سکتا ہے مثلاً ہم نے لنڈن تو نہیں دیکھا، صرف دیکھنے والوں سے اس شہر کا وجود سُنا ہے۔ مگر کیا ہم شک کر سکتے ہیں کہ شاید ان سب نے جھوٹ بول دیا ہو گا۔ یا مثلاً ہم نے عالمگیر بادشاہ کا زمانہ نہیں پایا اور نہ عالمگیر کی شکل دیکھی

---

[1] ۶۷ : ۱۱ ، [2] ۲ : ۲۸۷ ،

ہے۔ مگر کیا ہمیں اِس بات میں کچھ بھی شُبہ ہے کہ عالمگیر چغتائی بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا۔ پس ایسا یقین کیوں حاصل ہُوا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ صرف سماع کے تواتر سے۔ پس اس میں شک نہیں کہ سماع بھی علم الیقین کے مرتبہ تک پہنچتا ہے۔ نبیوں کی کتابیں اگر سلسلۂ سماع میں کچھ خلل نہ رکھتی ہوں وُہ بھی ایک سماعی علم کا ذریعہ ہیں۔ لیکن اگر ایک کتاب آسمانی کتاب کہلا کر پھر مثلاً پچاس ساٹھ نُسخے اس کے پائے جائیں اور بعض بعض کے مخالف ہوں تو گو کسی فریق نے یقین بھی کر لیا ہو کہ ان میں سے صرف دو چار صحیح ہیں اور باقی وضعی اور جعلی۔ لیکن محقق کے لئے ایسا یقین جو کسی کامل تحقیقات پر مبنی نہیں بے ہُودہ ہوگا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وُہ سب کتابیں اپنے تناقض کی وجہ سے ردّی اور ناقابلِ اعتبار قرار دی جائیں گی اور ہرگز جائز نہیں ہوگا کہ ایسے متناقض بیانات کو کسی علم کا ذریعہ ٹھہرایا جائے۔ کیونکہ علم کی یہ تعریف ہے کہ ایک یقینی معرفت عطا کرے۔ اور مجموعۂ متناقضات میں یقینی معرفت کا پایا جانا ممکن نہیں ؂

اِس جگہ یاد رہے **قرآن شریف** صرف سماع کی حد تک محدُود نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں انسانوں کے سمجھانے کے لئے بڑے بڑے معقول دلائل ہیں۔ اور جس قدر عقائد اور اصول اور احکام اُس نے پیش کئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا امر نہیں جس میں زبردستی اور تحکّم ہو جیسا کہ اس نے خود فرما دیا ہے کہ یہ سب عقائد وغیرہ انسان کی فطرت میں پہلے سے منقوش ہیں۔ اور قرآن شریف کا نام **ذِکر** رکھا ہے جیسا کہ فرماتا

ہے هٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ [1] یعنی یہ قرآن بابرکت کوئی نئی چیز نہیں لایا بلکہ جو کچھ انسان کی فطرت اور صحیفۂ قدرت میں بھرا پڑا ہے اُس کو یاد دلاتا ہے۔ اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے :۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ [2]

یعنی یہ دین کوئی بات جبر سے منوانا نہیں چاہتا بلکہ ہر ایک بات کے دلائل پیش کرتا ہے۔ ماسوا اس کے قُرآن میں دِلوں کو روشن کرنے کے لئے ایک رُوحانی خاصیت بھی ہے۔ جیسا کہ وُہ فرماتا ہے :۔

شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ [3]۔

یعنی قرآن اپنی خاصیت سے تمام بیماریوں کو دُور کرتا ہے۔ اِس لئے اس کو منقولی کتاب نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ وہ اعلےٰ درجہ کے معقول دلائل اپنے ساتھ رکھتا ہے اور ایک چمکتا ہوُا نور اس میں پایا جاتا ہے ؎

اَیسا ہی عقلی دلائل جو صحیح مقدّمات سے مستنبط ہوئے ہوں بلاشُبہ علم الیقین تک پہنچاتے ہیں۔ اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ آیاتِ مندرجہ ذیل میں اشارہ فرماتا ہے۔ جیسا کہ وُہ کہتا ہے :۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا

---

[1] ۲:۲۵۷، [2] ۱۰:۵۸، [3]

سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ○

یعنی جب دانشمند اور اہلِ عقل انسان زمین اور آسمان کے اجرام کی بناوٹ میں غور کرتے اور رات اور دن کی کمی بیشی کے موجبات اور علل کو نظرِ عمیق سے دیکھتے ہیں اُنھیں اس نظام پر نظر ڈالنے سے خُدا تعالےٰ کے وجود پر دلیل ملتی ہے۔ پس وُہ زیادہ انکشاف کے لئے خُدا سے مدد چاہتے ہیں۔ اور اس کو کھڑے ہوکر اور بیٹھ کر اور کروٹ پر لیٹ کر یاد کرتے ہیں جس سے ان کی عقلیں بہت صاف ہوجاتی ہیں پس جب وُہ اُن عقلوں کے ذریعہ سے اجرامِ فلکی اور زمینی کی بناوٹ احسن اور اولیٰ میں فکر کرتے ہیں تو بے اختیار بول اُٹھتے ہیں کہ ایسا نظامِ ابلغ اور محکم ہرگز باطل اور بے سُود نہیں بلکہ صانعِ حقیقی کا چہرہ دکھلا رہا ہے۔ پس وُہ الُوہیّتِ صانعِ عالم کا اقرار کرکے یہ مُناجات کرتے ہیں کہ یا الٰہی تو اس سے پاک ہے کہ کوئی تیرے وجود سے انکار کرکے نالائق صفتوں سے تجھے موصوف کرے۔ سو تو ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا۔ یعنی تجھ سے انکار کرنا عین دوزخ ہے۔ اور تمام آرام اور راحت تُجھ میں اور تیری شناخت میں ہے۔ جو شخص کہ تیری سچّی شناخت سے محروم رہا وُہ درحقیقت اِسی دُنیا میں آگ میں ہے ؎

اِنسانی فِطرت کی حقیقت

ایسا ہی ایک عِلم کا ذریعہ انسانی کانشنس بھی ہے جس کا نام خُداکی

۱؎ ۳ : ۱۹۲ ،

کتاب میں انسانی فطرت رکھا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا

یعنی خُدا کی فِطرت جس پر لوگ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور وُہ نقشِ فِطرت کیا ہے یہی کہ خُدا تعالیٰ کو واحد لاشریک، خالق الکل، مرنے اور پیدا ہونے سے پاک سمجھنا۔ اور ہم کانشنس کو علم الیقین کے مرتبہ پر اِس لئے کہتے ہیں کہ گو بظاہر اس میں ایک عِلم سے دُوسرے عِلم کی طرف انتقال نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ دھُوئیں کے عِلم سے آگ کے عِلم کا ہر طرف انتقال پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک قسم کے باریک انتقال سے یہ مرتبہ خالی نہیں ہے۔ اور وُہ یہ ہے کہ ہر ایک چیز میں خُدا نے ایک نامعلوم خاصیّت رکھی ہے جو بیان اور تقریر میں نہیں آسکتی۔ لیکن اس چیز پر نظر ڈالنے اور اس کا توقّف کرنے سے بلا توقّف اس خاصیت کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ غرض وُہ خاصیت اس وجود کو ایسی لازم پڑی ہوتی ہے جیسی کہ آگ کو دُھواں لازم ہے مثلاً جب ہم خُدائے تعالےٰ کی ذات کی طرف توجّہ کرتے ہیں کہ کیسی ہونی چاہیئے آیا خُدا ایسا ہونا چاہئے کہ ہماری طرح پیدا ہو۔ اور ہماری طرح دُکھ اُٹھاوے اور ہماری طرح مرے تو معًا اِس تصوّر سے ہمارا دِل دُکھتا اور کانشنس کانپتا ہے اور اس قدر جوش دِکھلاتا ہے کہ گویا اِس خیال کو دھکّے دیتا ہے اور بول اُٹھتا ہے کہ وُہ خُدا جس کی طاقتوں پر تمام اُمیدوں کا مدار ہے وُہ تمام نقصانوں سے پاک اور کامل اور قوی چاہئے۔ اور جب ہی خُدا کا

ؔ ۳۰ : ۳۱

خیال ہمارے دِل میں آتا ہے معًا توحید اور خُدا میں دھوئیں اور آگ کی طرح بلکہ اس سے بہُت زیادہ ملازمتِ تامہ کا احساس ہوتا ہے۔ لہٰذا جو علم ہمیں ہمارے کانشنس کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے وہ علم الیقین کے مرتبہ میں داخل ہے۔ لیکن اس پر ایک اَور مرتبہ ہے جو عین الیقین کہلاتا ہے۔ اور اس مرتبہ سے اس طور کا علم مُراد ہے کہ جب ہمارے یقین اور اس چیز میں جس پر کسی نوع کا یقین کیا گیا ہے کوئی درمیانی واسطہ نہ ہو۔ مثلاً جب ہم قُوّتِ شامہ کے ذریعہ سے ایک خوشبو یا بدبُو کو معلوم کرتے ہیں۔ اور یا ہم قُوّتِ ذائقہ کے ذریعہ سے شیریں یا نمکین پر اطلاع پاتے ہیں یا قُوّتِ حاسّہ کے ذریعہ سے گرم یا سرد کو معلوم کرتے ہیں تو یہ تمام معلومات ہمارے عین الیقین کی قسم میں داخل ہیں۔ مگر عالمِ ثانی کے بارے میں ہمارا علمِ الٰہیات تب عین الیقین کی حد تک پہنچتا ہے کہ جب خود بلا واسطہ ہم الہام پاویں۔ خُدا کی آواز کو اپنے کانوں سے سُنیں اور خُدا کے صاف اور صحیح کشفوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ ہم بے شک کامل معرفت کے حاصل کرنے کیلئے بلا واسطہ الہام کے محتاج ہیں۔ اور اس کامل معرفت کی ہم اپنے دِل میں بھُوک اور پیاس بھی پاتے ہیں۔ اگر خُدا تعالےٰ نے ہمارے لئے پہلے سے اِس معرفت کا سامان میسّر نہیں کیا تو یہ پیاس اور بھُوک ہمیں کیوں لگا دی ہے۔ کیا ہم اس زِندگی میں جو ہماری آخرت کے ذخیرہ کے لئے یہی ایک پیمانہ ہے اس بات پر راضی ہو سکتے ہیں کہ ہم اس سچّے اور کامل اور قادر اور زندہ خُدا پر صرف قصّوں اور کہانیوں کے رنگ میں ایمان لاویں۔

یا محض عقلی معرفت پر کفایت کریں جواب تک ناقص اور ناتمام معرفت ہے
کیا خُدا کے سچّے عاشقوں اور حقیقی دِلدادوں کا دل نہیں چاہتا کہ اس محبوب
کے کلام سے لذّت حاصل کریں؟ کیا جنھوں نے خدا کے لئے تمام دُنیا
کو برباد کیا، دِل کو دیا، جان کو دیا۔ وُہ اِس بات پر راضی ہو سکتے ہیں
کہ صرف ایک دھندلی سی روشنی میں کھڑے رہ کر مرتے رہیں اور اُس
آفتاب صداقت کا مُنہ نہ دیکھیں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اس زِندہ خُدا
کا اَنَا الْمَوْجُوْدُ کہنا وُہ معرفت کا مرتبہ عطا کرتا ہے کہ اگر دُنیا کے
تمام فلاسفروں کی خود تراشیدہ کتابیں ایک طرف رکھیں اور ایک طرف اَنَا
الْمَوْجُوْد خُدا کا کہنا۔ تو اس کے مقابل وُہ تمام دفتر ہیچ ہیں۔ جو فلاسفر کہلا کر
اندھے رہے وُہ ہمیں کیا سکھلائیں گے۔ غرض اگر خُدا تعالےٰ نے حق کے
طالبوں کو کامل معرفت دینے کا ارادہ فرمایا ہے تو ضرور اس نے اپنے مکالمہ
اور مخاطبہ کا طریق کھلا رکھا ہے۔ اس بارے میں اللہ جلّ شانہٗ قرآن شریف
میں یہ فرماتا ہے:۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ
اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔

یعنی اے خُدا ہمیں وُہ استقامت کی راہ بتا جو راہ اُن لوگوں کی ہے جن
پر تیرا انعام ہُوا ہے۔ اس جگہ انعام سے مُراد الہام اور کشف وغیرہ آسمانی
علوم ہیں جو انسان کو براہِ راست ملتے ہیں۔ ایسا ہی ایک دُوسری جگہ
فرماتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ؁

یعنی جو لوگ خدا پر ایمان لاکر پُوری پُوری استقامت اختیار کرتے ہیں۔ اُن پر خُدائے تعالےٰ کے فرشتے اُترتے ہیں۔ اور یہ الہام اُن کو کرتے ہیں کہ تم کچُھ خوف اور غم نہ کرو۔ تمھارے لئے وُہ بہشت ہے جس کے بارے میں تمھیں وعدہ دیا گیا ہے۔ سو اس آیت میں بھی صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ خُدائے تعالےٰ کے نیک بندے غم اور خوف کے وقت خُدا سے الہام پاتے ہیں۔ اور فرِشتے اُتر کر اُن کی تسلّی کرتے ہیں۔ اور پھر ایک اور آیت میں فرمایا ہے :-

لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ؂

یعنی خُدا کے دوستوں کو الہام اور خُدا کے مکالمہ کے ذریعہ سے اِس دُنیا میں خوش خبری ملتی ہے اور آئندہ زِندگی میں بھی ملے گی ؂

الہام سے کیا مُراد ہے ؟

لیکن اس جگہ یاد رہے کہ الہام کے لفظ سے اس جگہ یہ مُراد نہیں ہے کہ سوچ اور فکر کی کوئی بات دِل میں پڑ جائے جیسا کہ جب شاعر شعر کے بنانے میں کوشش کرتا ہے یا ایک مصرع بنا کر دُوسرا سوچتا رہتا ہے تو دوسرا مصرع دِل میں پڑتا ہے۔ سو یہ دِل میں پڑ جانا الہام نہیں ہے بلکہ یہ خُدا

کے قانونِ قدرت کے موافق اپنے فکر اور سوچ کا ایک نتیجہ ہے جو شخص اچھی باتیں سوچتا ہے یا بُری باتوں کے لئے فکر کرتا ہے۔ اس کی تلاش کے موافق کوئی بات ضرور اس کے دِل میں پڑ جاتی ہے۔ ایک شخص مثلاً نیک اور راست باز آدمی ہے جو سچائی کی حمایت میں چند شعر بناتا ہے اور دُوسرا شخص جو ایک گندہ اور پلید آدمی ہے اپنے شعروں میں جھُوٹ کی حمایت کرتا ہے اور راست بازوں کو گالیاں نکالتا ہے تو بلاشُبہ یہ دونوں کچھُ نہ کچھ شعر بنالیں گے بلکہ کچھُ تعجّب نہیں کہ وُہ راست بازوں کا دشمن جو جھُوٹ کی حمایت کرتا ہے بباعث دائمی مشق کے اُس کا شعر عمُدہ ہو۔ سو اگر صرف دِل میں پڑ جانے کا نام الہام ہے تو پھر ایک بد معاش شاعر جو راست بازی اور راست بازوں کا دشمن اور ہمیشہ حق کی مخالفت کے لئے قلم اُٹھاتا اور افتراؤں سے کام لیتا ہے خُدا کا مُلہم کہلائے گا۔ دُنیا میں ناولوں وغیرہ میں جادُو بیانیاں پائی جاتی ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ اس طرح سراسر باطل مگر مسلسل مضمون لوگوں کے دِلوں میں پڑتے ہیں۔ کیا ہم اُن کو الہام کہہ سکتے ہیں؟ بلکہ اگر الہام صرف دِل میں بعض باتیں پڑ جانے کا نام ہے تو ایک چور بھی ملہم کہلا سکتا ہے۔ کیونکہ وُہ بسا اوقات فِکر کر کے اچھے اچھّے طریق نقب زنی کے نِکال لیتا ہے۔ اور عمُدہ عمُدہ تدبیریں ڈاکہ مارنے اور خونِ ناحق کرنے کی اس کے دِل میں گذر جاتی ہیں تو کیا لائق ہے کہ ہم ان تمام ناپاک طریقوں کا نام الہام رکھ دیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ اُن لوگوں کا خیال ہے جن کو اب تک اس سچے خدُا کی خبر نہیں جو آپ خاص مکالمہ سے دِلوں کو تسلی دیتا

اور ناواقفوں کو رُوحانی علوم سے معرفت بخشتا ہے ۔

الہام کیا چیز ہے ؛ وُہ پاک اور قادر خدا کا ایک برگزیدہ بندہ کیساتھ یا اُس کے ساتھ جس کو برگزیدہ کرنا چاہتا ہے ایک زندہ اور باقدرت کلام کے ساتھ مکالمہ اور مخاطبہ ہے۔ سو جب یہ مکالمہ اور مخاطبہ کافی اور تسلّی بخش سلسلہ کے ساتھ شروع ہو جائے اور اس میں خیالاتِ فاسدہ کی تاریکی نہ ہو اور نہ غیر مکتفی اور چند بے سروپا لفظ ہوں اور کلام لذیذ اور پُر حکمت اور پُر شوکت ہو تو وُہ خُدا کا کلام ہے۔ جس سے وُہ اپنے بندے کو تسلّی دینا چاہتا ہے۔ اور اپنے تئیں اس پر ظاہر کرتا ہے۔ ہاں کبھی ایک کلام محض امتحان کے طور پر ہوتا ہے۔ اور وُہ پُورا اور بابرکت سامان ساتھ نہیں رکھتا۔ اس میں خدائے تعالیٰ کے بندے کو اسکی ابتدائی حالت میں آزمایا جاتا ہے تا وُہ ایک ذرّہ الہام کا مزہ چکھ کر پھر واقعی طور پر اپنا حال و قال سچّے ملہموں کی طرح بناوے یا ٹھوکر کھاوے۔ پس اگر وُہ حقیقی راستبازی صدیقوں کی طرح اختیار نہیں کرتا تو اس نعمت کے کمال سے محروم رہ جاتا ہے اور صرف بے ہُودہ لاف زنی اُس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کروڑہا نیک بندوں کو الہام ہوتا رہا ہے۔ مگر اُن کا مرتبہ خُدا کے نزدیک ایک درجہ کا نہیں بلکہ خُدا کے پاک نبی جو پہلے درجہ پر کمال صفائی سے خدا کا الہام پانے والے ہیں وُہ بھی مرتبہ میں برابر نہیں۔ خدائے تعالےٰ فرماتا ہے :-

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ

ﮮ ۲ : ۲۵۴ ،

یعنی بعض نبیوں کو بعض نبیوں پر فضیلت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ الہام محض فضل ہے۔ اور فضیلت کے وجود میں اس کو دخل نہیں۔ بلکہ فضیلت اس صدق اور اخلاص اور وفاداری کی قدر پر ہے جس کو خدا جانتا ہے۔ ہاں الہام بھی اگر اپنی بابرکت شرائط کے ساتھ ہو تو وہ بھی ان کا ایک پھل ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر اس رنگ میں الہام ہو کہ بندہ سوال کرتا ہے، اور خدا اس کا جواب دیتا ہے۔ اسی طرح ایک ترتیب کے ساتھ سوال و جواب ہو اور الٰہی شوکت اور نورِ الہام میں پایا جاوے اور علومِ غیب یا معارفِ صحیحہ پر مشتمل ہو تو وہ خدا کا الہام ہے۔ خدا کے الہام میں یہ ضروری ہے کہ جس طرح ایک دوست دوسرے دوست سے مل کر باہم ہمکلام ہوتا ہے۔ اسی طرح رب اور اس کے بندے میں ہم کلامی واقع ہو۔ اور جب یہ کسی امر میں سوال کرے تو اس کے جواب میں ایک کلام لذیذ فصیح خدائے تعالیٰ کی طرف سے سُنے۔ جس میں اپنے نفس اور فکر اور غور کا کچھ بھی دخل نہ ہو۔ اور وہ مکالمہ اور مخاطبہ اس کے لئے موہبت ہو جائے تو وہ خدا کا کلام ہے۔ اور ایسا بندہ خدا کی جناب میں عزیز ہے۔ مگر یہ درجہ کہ الہام بطور موہبت ہو اور زندہ اور پاک الہام کا سلسلہ اپنے بندہ سے خدا کو حاصل ہو اور صفائی اور پاکیزگی کے ساتھ ہو، یہ کسی کو نہیں ملتا۔ بجز ان لوگوں کے جو ایمان اور اخلاص اور اعمالِ صالحہ میں ترقی کریں اور نیز اس چیز میں جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے۔ سچّا اور پاک الہام الوہیت کے بڑے بڑے کرشمے دکھلاتا ہے۔ بارہا ایک نہایت چمکدار نور پیدا ہوتا ہے اور ساتھ اس

کے پُر شوکت اور ایک چمکدار الہام آتا ہے۔ اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا کہ مُلہم اُس ذات سے باتیں کرتا ہے جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ دُنیا میں خُدا کا دیدار یہی ہے کہ خُدا سے باتیں کرے۔ مگر اس ہمارے بیان میں اِنسان کی وُہ حالت داخل نہیں ہے جو کسی کی زبان پر بے ٹھکانا کوئی لفظ یا فِقرہ یا شعر جاری ہو، اور ساتھ اس کے کوئی مکالمہ یا مخاطبہ نہ ہو بلکہ ایسا شخص خُدا کے امتحان میں گرِفتار ہے۔ کیونکہ خُدا اِس طریق سے بھی سُست اور غافل بندوں کو آزماتا ہے کہ کبھی کوئی فقرہ یا عبارت کسی کے دِل پر یا زبان پر جاری کی جاتی ہے اور وُہ شخص اندھے کی طرح ہوجاتا ہے۔ نہیں جانتا کہ وُہ عبارت کہاں سے آئی، خُدا سے یا شیطان سے۔ سو ایسے فقرات سے استغفار لازم ہے۔ لیکن اگر ایک صالح اور نیک بندہ کو بے حجاب مکالمۂ الٰہی شروع ہوجائے اور مخاطبہ اور مکالمہ کے طور پر ایک کلامِ روشن، لذیذ، پُرمعنی، پُرحکمت پوری شوکت کے ساتھ اُس کو سُنائی دے۔ اور کم سے کم اس کو بارہا ایسا اتّفاق ہؤا ہو کہ خُدا میں اور اُس میں عین بیداری میں دس مرتبہ سوال و جواب ہؤا ہو۔ اُس نے سوال کیا اور خُدا نے جواب دِیا۔ پھر اُسی وقت عین بیداری میں اس نے کوئی اَور عرض کی اور خُدا نے اس کا بھی جواب دِیا۔ پھر گذارشِ عاجزانہ کی خُدا نے اُس کا بھی جواب عطا فرمایا۔ ایسا ہی دس مرتبہ تک خُدا میں اور اُس میں باتیں ہوتی رہیں۔ اور خُدا نے بارہا ان مکالمات میں اُس کی دُعائیں منظور کی ہوں۔ عُمدہ عُمدہ معارف پر اُس کو اِطلاع دی ہو۔ آنے والے واقعات کی اُس کو خبر

دی ہو اور اپنے برہنہ مکالمہ سے بار بار کے سوال و جواب میں اسکو مشرف کیا ہو تو ایسے شخص کو خدائے تعالیٰ کا بہت شکر کرنا چاہیئے۔ اور سب سے زیادہ خدا کی راہ میں فدا ہونا چاہئے۔ کیونکہ خدا نے محض اپنے کرم سے اپنے تمام بندوں میں سے اُسے چُن لیا اور ان صدیقوں کا اس کو وارث بنا دیا جو اس سے پہلے گذر چکے ہیں۔ یہ نعمت نہایت ہی نادر الوقوع اور خوش قسمتی کی بات ہے۔ جس کو ملی اس کے بعد جو کچھ ہے وہ ہیچ ہے ❊

اسلام کی خصوصیت

اس مرتبہ اور اس مقام کے لوگ اسلام میں ہمیشہ ہوتے رہے ہیں۔ اور ایک اسلام ہی ہے جس میں خدا بندے سے قریب ہو کر اس سے باتیں کرتا، وہ اس کے اندر بولتا ہے۔ اور اس کے دِل میں اپنا تخت بناتا اور اس کے اندر سے اسے آسمان کی طرف کھینچتا ہے۔ اور اس کو وہ سب نعمتیں عطا فرماتا ہے جو پہلوں کو دی گئیں۔ افسوس اندھی دُنیا نہیں جانتی کہ انسان نزدیک ہوتا ہوتا کہاں تک پہنچ جاتا ہے وُہ آپ تو قدم نہیں اُٹھاتے اور جو قدم اُٹھائے تو یا تو اس کو کافر ٹھہرایا جاتا ہے اور یا اس کو معبُود ٹھہرا کر خدا کی جگہ دی جاتی ہے۔ یہ دونوں ظُلم ہیں، ایک افراط سے اور ایک تفریط سے پیدا ہوا۔ مگر عقلمند کو چاہیئے کہ وُہ کم ہمّت نہ ہو اور اس مقام اور اس مرتبہ کا انکاری نہ رہے۔ اور صاحب اس مرتبہ کی کسرِ شان نہ کرے اور نہ اس کی پُوجا شرُوع کر دے۔ اس مرتبہ پر خُدائے تعالےٰ وُہ تعلّقات اس بندہ سے ظاہر کرتا ہے کہ گویا

اپنی الوہیت کی چادر اس پر ڈال دیتا ہے۔ اور ایسا شخص خدا کے دیکھنے کا آئینہ بن جاتا ہے۔ یہی بھید ہے جو ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جس نے مجھے دیکھا اُس نے خدا کو دیکھ لیا۔ غرض یہ بندوں کے لئے انتہائی تنبیہ ہے اور اس پر تمام سلوک ختم ہو جاتے ہیں اور پوری تسلّی ملتی ہے؎

مقرّر کا مکالمہ و مخاطبہ الٰہیّہ سے مشرّف ہونا

مَیں بنی نوع پر ظلم کروں گا اگر مَیں اس وقت ظاہر نہ کروں کہ وُہ مقام جس کی مَیں نے یہ تعریفیں کی ہیں اور وہ مرتبہ مکالمہ اور مخاطبہ کا جس کی مَیں نے اِس وقت تفصیل بیان کی وُہ خدا کی عنایت نے مجھے عنایت فرمایا ہے تا مَیں اندھوں کو بینائی بخشوں۔ اور ڈھونڈنے والوں کو اس گم گشتہ کا پتہ دُوں اور سچائی کو قبول کرنے والوں کو اُس پاک چشمہ کی خوش خبری سُناؤں جس کا تذکرہ بہتوں میں ہے اور پانے والے تھوڑے ہیں۔ مَیں سامعین کو یقین دِلاتا ہُوں کہ وُہ خدا جس کے مِلنے میں انسان کی نجات اور دائمی خوش حالی ہے وُہ بجز قرآن شریف کی پیروی کے ہرگز نہیں مل سکتا۔ کاش جو مَیں نے دیکھا ہے لوگ دیکھیں اور جو مَیں نے سُنا ہے وہ سُنیں اور قصّوں کو چھوڑ دیں اور حقیقت کی طرف دوڑیں۔ وُہ کامل عِلم کا ذریعہ جس سے خُدا نظر آتا ہے۔ وہ میل اُتارنے والا پانی جس سے تمام شکوک دُور ہو جاتے ہیں۔ وُہ آئینہ جس سے اس برتر ہستی کا درشن ہو جاتا ہے خُدا کا وُہ مکالمہ اور مخاطبہ ہے جس کا مَیں ابھی ذکر کر چکا ہُوں جس کی

رُوح میں سچائی کی طلب ہے وُہ اُٹھے اور تلاش کرے۔ مَیں سچ سچ کہتا ہُوں کہ اگر رُوحوں میں سچّی تلاش پیدا ہو اور دِلوں میں سچّی پیاس لگ جائے تو لوگ اس طریق کو ڈھونڈیں اور اس راہ کی تلاش میں لگیں۔ مگر یہ راہ کِس طریق سے کھُلے گی۔ اور حجاب کِس دوا سے اُٹھے گا۔ مَیں سب طالبوں کو یقین دِلاتا ہُوں کہ صرف اسلام ہی ہے جو اِس راہ کی خوشخبری دیتا ہے۔ اور دُوسری قومیں تو خدا کے الہام پر مُدّت سے مُہر لگا چکی ہیں۔ سو یقیناً سمجھو کہ یہ خُدا کی طرف سے مُہر نہیں بلکہ محرومی کی وجہ سے انسان ایک حیلہ پیدا کر لیتا ہے۔ اور یقیناً یہ سمجھو کہ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ہم بغیر آنکھوں کے دیکھ سکیں یا بغیر کانوں کے سُن سکیں یا بغیر زبان کے بول سکیں اِسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ بغیر قرآن کے اس پیارے محبُوب کا مُنہ دیکھ سکیں۔ مَیں جوان تھا اب بُوڑھا ہؤا۔ مگر مَیں نے کوئی نہ پایا جس نے بغیر اس پاک چشمہ کے اس کھلی کھلی معرفت کا پیالہ پیا ہو ؏

کامل علم کا ذریعہ خُدائے تعالیٰ کا الہام ہے

اے عزیزو! اے پیارو!! کوئی اِنسان خُدا کے ارادوں میں اس سے لڑائی نہیں کر سکتا۔ یقیناً سمجھ لو کہ کامل علم کا ذریعہ خُدائے تعالیٰ کا الہام ہے جو خُدائے تعالےٰ کے پاک نبیوں کو ملا۔ پھر بعد اس کے اس خُدائے جو دریائے فیض ہے یہ ہرگز نہ چاہا کہ آئندہ اس الہام کو مُہر لگا دے اور اس طرح پر دُنیا کو تباہ کرے۔ بلکہ اس کے الہام اور مکالمے اور مخاطبے کے

ہمیشہ دروازے کھلے ہیں۔ ہاں اُن کو ان کی راہوں سے ڈھونڈو۔ تب وُہ آسانی سے تمھیں ملیں گے۔ وہ زندگی کا پانی آسمان سے آیا اور اپنے مناسب مقام پر ٹھہرا۔ اب تمھیں کیا کرنا چاہیئے تا تم اس پانی کو پی سکو۔ یہی کرنا چاہیئے کہ افتاں وخیزاں اُس چشمہ تک پہنچو۔ پھر اپنا مُنہ اس چشمہ کے آگے رکھ دو تا اس زندگی کے پانی سے سیراب ہو جاؤ۔ انسان کی تمام سعادت اسی میں ہے کہ جہاں روشنی کا پتہ لگے اسی طرف دوڑے اور جہاں اس گم گشتہ دوست کا نشان پیدا ہو اسی راہ کو اختیار کرے۔ دیکھتے ہو کہ ہمیشہ آسمان سے روشنی اُترتی اور زمین پر پڑتی ہے۔ اسی طرح ہدایت کا سچّا نور آسمان سے ہی اُترتا ہے۔ انسان کی اپنی ہی باتیں اور اپنی ہی اٹکلیں سچّا گیان اس کو نہیں بخش سکتیں۔ کیا تم خدا کو بغیر خدا کی تجلّی کے پا سکتے ہو؟ کیا تم بغیر اس آسمانی روشنی کے اندھیرے میں دیکھ سکتے ہو؟ اگر دیکھ سکتے ہو تو شاید اس جگہ بھی دیکھ لو۔ مگر ہماری آنکھیں گو بینا ہوں تاہم آسمانی روشنی کی محتاج ہیں۔ اور ہمارے کان گو شنوا ہوں تاہم اس ہوا کے حاجت مند ہیں جو خُدا کی طرف سے چلتی ہیں۔ وہ خدا سچّا خدا نہیں ہے جو خاموش ہے اور سارا مدار ہماری اٹکلوں پر ہے۔ بلکہ کامل اور زندہ خدا وُہ ہے جو اپنے وجود کا آپ پتہ دیتا رہا ہے۔ اور اب بھی اُس نے یہی چاہا ہے کہ آپ اپنے وجود کا پتہ دیوے۔ آسمانی کھڑکیاں کھُلنے کو ہیں۔ عنقریب صُبحِ صادق ہونے والی ہے۔ مُبارک وُہ جو اُٹھ بیٹھیں اور اب سچّے خُدا کو ڈھونڈیں۔ وُہی خُدا جس پر کوئی گردش

اور مُصیبت نہیں آتی۔ جس کے جلال کی چمک پر کبھی حادثہ نہیں پڑتا۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[۱]

یعنی خُدا ہی ہے جو ہر دم آسمان کا نور اور زمین کا نُور ہے اُسی سے ہر ایک جگہ روشنی پڑتی ہے۔ آفتاب کا وُہی آفتاب ہے۔ زمین کے تمام جانداروں کی وُہی جان ہے۔ سچّا زِندہ خُدا وُہی ہے۔ مُبارک وُہ جو اس کو قبُول کرے ؂

تیسرا عِلم کا ذریعہ وہ امور ہیں جو حقّ الیقین کے مرتبہ پر ہیں اور وُہ تمام شدائد اور مصائب اور تکالیف ہیں جو خُدا کے نبیوں اور راست بازوں کو مخالفوں کے ہاتھ سے یا آسمانی قضا و قدر سے پہنچتے ہیں۔ اور اس قسم کے دُکھوں اور تکلیفوں سے وُہ تمام شرعی ہدایتیں جو محض عِلمی طور پر انسان کے دِل میں تھیں اس پر وارد ہو کر عملی رنگ میں آجاتی ہیں اور پھر عمل کی زمین سے نشوونما پاکر کمالِ تام تک پہنچ جاتی ہیں اور عمل کرنے والوں کو اپنا ہی وجُود ایک نسخہ مکمّل خُدا کی ہدایتوں کا ہو جاتا ہے۔ اور وُہ تمام اخلاق عفو اور انتقام اور صبر اور رحم وغیرہ جو صرف دماغ اور دِل میں بھرے ہوئے تھے اب تمام اعضاء کو عملی مزاولت کی برکت سے اُن سے حِصّہ مِلتا ہے۔ اور وُہ تمام جسم پر وارد ہو کر اپنے نقش و نگار اس پر جما دیتے ہیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے :-

---

[۱] ۲۴ : ۳۵

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ○ لَتُبْلَوُنَّ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَذًى كَثِيْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○

یعنی ہم تمہیں خوف اور فاقہ اور مال کے نقصان اور جان کے نقصان اور کوشش ضائع جانے اور اولاد کے فوت ہو جانے سے آزمائیں گے۔ یعنی یہ تمام تکلیفیں قضاء و قدر کے طور پر یا دشمن کے ہاتھ سے تمہیں پہنچیں گی۔ سو اُن لوگوں کو خوش خبری ہو جو مصیبت کے وقت صرف یہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے ہیں اور خدا کی طرف رجوع کریں گے۔ اِن لوگوں پر خُدا کا درُود اور رحمت ہے، اور یہی وُہ لوگ ہیں جو ہدایت کے کمال تک پہنچ گئے ہیں۔ یعنی محض اِس علم میں کُچھ شرف اور بزُرگی نہیں جو صرف دماغ اور دِل میں بھرا ہُوا ہو۔ بلکہ حقیقت میں علم وُہ ہے کہ دماغ سے اُتر کر تمام اعضاء اس سے متأدب اور رنگین ہو جائیں اور حافظہ کی یادداشتیں عملی رنگ دکھائی دیں۔ سو علم کے مستحکم کرنے اور اس کے ترقّی دینے کا یہ بڑا ذریعہ ہے کہ عملی طور پر اس کے نقوش اپنے

ل ۲: ۱۵۶ - ۱۵۸، ل ۳: ۱۸۷،

اعضاء میں جالیں۔ کوئی ادنیٰ علم بھی عملی مزاولت کے بغیر اپنے کمال کو نہیں پہنچتا۔ مثلاً مدّت دراز سے ہمارے علم میں یہ بات ہے کہ روٹی پکانا نہایت ہی سہل بات ہے۔ اور اس میں کوئی زیادہ باریکی نہیں۔ صرف اتنا ہے کہ آٹا گوندھ کر اور بقدر ایک ایک روٹی کے اُس آٹے کے پیڑے بنا دیں اور ان کو دونوں ہاتھوں کے باہم ملانے سے چوڑے کر کے توے پر ڈال دیں۔ اور اِدھر اُدھر پھیر کر اور آگ پر سینک کر رکھ لیں۔ روٹی پک جائیگی یہ تو ہماری صرف علمی لاف وگزاف ہے۔ لیکن جب ہم ناتجربہ کاری کی حالت میں پکانے لگیں تو اوّل ہم پر یہی مصیبت پڑے گی کہ آٹے کو اس کے مناسب قوام پر رکھ سکیں بلکہ یا تو پتھّر سا رہیگا اور یا پتلا ہو کر گُلگلوں کے لائق ہو جائیگا اور اگر مر مر کر تھک کر گوندھ بھی لیا تو روٹی کا یہ حال ہو گا کہ کچھ جلیگی اور کچھ کچّی رہے گی۔ بیچ میں ٹکیہ رہے گی اور کئی طرف سے کان نکلے ہوئے ہونگے۔ حالانکہ پچاس برس تک ہم پکتی ہوئی دیکھتے رہے۔ غرض مجرّد علم کی شامت سے جو عملی مشق کے نیچے نہیں آیا کئی سیر آٹے کا نقصان کرینگے۔ پھر جب کہ ادنیٰ ادنیٰ سی بات میں ہمارے علم کا یہ حال ہے تو بڑے بڑے امُور میں بجز عملی مزاولت اور مشق کے صرف علم پر کیونکر بھروسہ رکھیں۔ سو خدائے تعالےٰ ان آیتوں میں یہ سکھاتا ہے کہ جو مصیبتیں میں تم پر ڈالتا ہوں وہ بھی علم اور تجربہ کا ذریعہ ہیں۔ یعنی ان سے تمہارا علم کامل ہوتا ہے ۔

اور پھر آگے فرماتا ہے کہ تم اپنے مالوں اور جانوں میں بھی آزمائے

جاؤ گے۔ لوگ تمہارے مال لُوٹیں گے تمھیں قتل کرینگے اور تم یہودیوں اور عیسائیوں اور مُشرکوں کے ہاتھ سے بہت ہی ستائے جاؤ گے۔ وُہ بہت کچھ ایذا کی باتیں تمہارے حق میں کہیں گے۔ پس اگر تم صبر کرو گے اور بے جا باتوں سے بچو گے تو یہ ہمّت اور بہادری کا کام ہوگا۔ اِن تمام آیات کا مطلب یہ ہے کہ بابرکت علم وہی ہوتا ہے جو عمل کے مرتبہ میں اپنی چمک دِکھاوے۔ اور منحُوس علم وُہ ہے جو صرف علم کی حد تک رہے کبھی عمل تک نوبت نہ پہنچے ؂

جاننا چاہیئے کہ جِس طرح مال تجارت سے بڑھتا ہے اور پھُولتا ہے ایسا ہی عِلم عملی مزاولت سے اپنے رُوحانی کمال کو پُہنچتا ہے۔ سو علم کو کمال تک پہنچانے کا بڑا ذریعہ عملی مزاولت ہے۔ مزاولت سے علم میں نُور آجاتا ہے۔ اور یہ سمجھو کہ علم کا حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچنا اور کیا ہوتا ہے۔ یہی تو ہے کہ عملی طور پر ہر ایک گوشہ اس کا آزمایا جاوے چنانچہ اسلام میں ایسا ہی ہوُا۔ جو کچھ خدائے تعالےٰ نے قرآن کے ذریعہ سے لوگوں کو سِکھایا ان کو یہ موقع دِیا کہ عملی طور پر اِس تعلیم کو چمکا دیں اور اس کے نور سے پُر ہو جاویں ؂

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کے دو۲ زمانے

اِسی غرض سے خُدا تعالیٰ نے ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سوانح کو دو حِصّوں پر منقسم کر دِیا ؂

ایک حصہ دُکھوں اور مُصیبتوں اور تکلیفوں کا اور دُوسرا حصہ فتحیابی کا تا مُصیبتوں کے وقت میں وہ خلق ظاہر ہوں جو مصیبتوں کے وقت ظاہر ہؤا کرتے ہیں اور فتح اور اقتدار کے وقت میں وُہ خلق ثابت ہوں جو بغیر اقتدار کے ثابت نہیں ہوتے۔ سو ایسا ہی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دونوں قسم کے اخلاق دونوں زمانوں اور دونوں حالتوں کے وارد ہونے سے کمال وضاحت سے ثابت ہو گئے۔ چنانچہ وُہ مصیبتوں کا زمانہ جو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلّم پر تیرہ برس تک مکّہ معظّمہ میں شامل حال رہا۔ اس زمانہ کی سوانح پڑھنے سے نہایت واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم نے وہ اخلاق جو مصیبتوں کے وقت کامل راست باز کو دِکھلانے چاہئیں یعنی خُدا پر توکّل رکھنا اور جزع فزع سے کنارا کرنا اور اپنے کام میں سُست نہ ہونا اور کسی کے رُعب سے نہ ڈرنا اَیسے طور پر دِکھلا دیئے جو کفار ایسی استقامت کو دیکھ کر ایمان لائے اور شہادت دی کہ جب تک کسی کا پُورا بھروسہ خُدا پر نہ ہو تو اس استقامت اور اس طور سے دُکھوں کی برداشت نہیں کر سکتا ؎

اور پھر جب دُوسرا زمانہ آیا یعنی فتح اور اقتدار اور ثروت کا زمانہ تو اس زمانہ میں بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اعلیٰ اخلاق عفو اور سخاوت اور شجاعت کے ایسے کمال کے ساتھ صادر ہوُئے جو ایک گروہِ کثیر کفار کا انہی اخلاق کو دیکھ کر ایمان لایا۔ دُکھ دینے والوں کو بخشا اور شہر سے نکالنے والوں کو امن دیا۔ اُن کے مُحتاجوں کو مال سے مالا مال کر دِیا اور

قابو پاکر اپنے بڑے بڑے دشمنوں کو بخش دیا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے آپ کے اخلاق دیکھ کر گواہی دی کہ جب تک خدا کی طرف سے اور حقیقتاً راست باز نہ ہو یہ اخلاق ہرگز نہیں دکھلا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے دشمنوں کے پرانے کینے یک لخت دور ہو گئے۔ آپ کا بڑا بھاری خلق جس کو آپ نے ثابت کر کے دکھلا دیا وہ خلق تھا جو قرآن شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے اور وہ یہ ہے :-

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ [1]

یعنی ان کو کہہ دے کہ میری عبادت اور میری قربانی اور میرا مرنا اور میرا جینا خدا کی راہ میں ہے یعنی اس کا جلال ظاہر کرنے کے لئے اور نیز اس کے بندوں کے آرام دینے کے لئے ہے تا میرے مرنے سے ان کو زندگی حاصل ہو۔ اس جگہ جو خدا کی راہ میں اور بندوں کی بھلائی کے لئے مرنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ آپ نے نعوذ باللہ جاہلوں اور دیوانوں کی طرح درحقیقت خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس وہم سے کہ اپنے تئیں کسی آلہ سے قتل کے ذریعہ سے ہلاک کر دینا اوروں کو فائدہ پہنچائے گا۔ بلکہ آپ ان بے ہودہ باتوں کے سخت مخالف تھے۔ اور قرآن ایسی خودکشی کے مرتکب کو سخت مجرم اور قابل سزا ٹھہراتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے :-

---

[1] الانعام ۶ : ۱۶۳،

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ [1]

یعنی خودکشی نہ کرو۔ اور اپنے ہاتھوں سے اپنی موت کے باعث نہ ٹھہرو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر مثلاً خالد کے پیٹ میں درد ہو اور زید اس پر رحم کر کے اپنا سر پھوڑ دے تو زید نے خالد کے حق میں کوئی نیکی کا کام نہیں کیا۔ بلکہ اپنے سر کو احمقانہ حرکت سے ناحق پھوڑا۔ نیکی کا کام تب ہوتا کہ جب زید خالد کیلئے مناسب اور مفید طریق کے ساتھ سرگرم رہتا اور اس کے لئے عمدہ دوائیں میسر کرتا اور طبابت کے قواعد کے موافق اس کا علاج کرتا۔ مگر اسکے سر کے پھوڑنے سے زید کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ ناحق اس نے اپنے وجود کے ایک شریف عضو کو دکھ پہنچایا۔ غرض اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی ہمدردی اور محنت اٹھانے سے بنی نوع کی رہائی کے لئے جان کو وقف کر دیا تھا۔ اور دعا کے ساتھ اور تبلیغ کے ساتھ اور ان کے جور و جفا اٹھانے کے ساتھ اور ہر ایک مناسب اور حکیمانہ طریق کے ساتھ اپنی جان اور اپنے آرام کو اس راہ میں فدا کر دیا تھا۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے:۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ [2]

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ [3]

کیا تو اس غم اور اس سخت محنت میں جو لوگوں کے لئے اٹھا رہا ہے۔ اپنے تئیں ہلاک کر دے گا۔ اور کیا ان لوگوں کے لئے جو حق کو قبول نہیں کرتے

---

[1] ۲:۱۹۶ [2] ۲۶:۴ ، [3] ۳۵:۹

تو حسرتیں کھا کھا کر اپنی جان دے گا۔ سو قوم کی راہ میں جان دینے کا حکیمانہ طریق یہی ہے کہ قوم کی بھلائی کے لیئے قانونِ قدرت کی مفید راہوں کے موافق اپنی جان پر سختی اُٹھاویں اور مناسب تدبیروں کے بجالانے سے اپنی جان اُن پر فدا کردیں۔ نہ یہ کہ قوم کو سخت بَلا یا گمراہی میں دیکھ کر اور خطرناک حالت میں پاکر اپنے سر پر پتھّر ماریں۔ یا دو تین رتی اسٹرکنیا کھاکر اس جہان سے رُخصت ہوجائیں اور پھر گمان کریں کہ ہم نے اپنی اِس حرکتِ بے جا سے قوم کو نجات دے دی ہے۔ یہ مَردوں کا کام نہیں ہے زنانہ خصلتیں ہیں۔ اور بے حوصلہ لوگوں کا ہمیشہ سے یہی طریق ہے۔ کہ مصیبت کو قابلِ برداشت نہ پاکر جھٹ پٹ خودکشی کی طرف دوڑتے ہیں۔ ایسی خودکشی کو بعد میں کتنی ہی تاوِیلیں کی جائیں مگر یہ حرکت بلاشُبہ عقل اور عقلمندوں کا ننگ ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا صبر اور دُشمن کا مقابلہ نہ کرنا معتبر نہیں ہے جس کو انتقام کا موقعہ ہی نہ ملا۔ کیونکہ کیا معلوم ہے کہ اگر وُہ انتقام پر قُدرت پاتا تو کیا کُچھ کرتا۔ جب تک انسان پر وُہ زمانہ نہ آوے جو ایک مُصیبتوں کا زمانہ اور ایک مقدرت اور حکومت اور ثروت کا زمانہ ہو اُس وقت تک اسکے سچّے اخلاق ہرگز ظاہر نہیں ہوسکتے۔ صاف ظاہر ہے کہ جو شخص صرف کمزوری اور ناداری اور بے اقتداری کی حالت میں لوگوں کی ماریں کھاتا مرجاوے اور اقتدار اور حکومت اور ثروت کا زمانہ نہ پاوے اُسکے اخلاق میں سے کچھ بھی ثابت نہ ہوگا اور کسی میدانِ جنگ میں حاضر نہیں ہؤا تو یہ بھی ثابت نہ ہوگا کہ وُہ دِل کا بہادر تھا یا بُزدِل۔ اُس کے اخلاق کی نسبت ہم کچُھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہم نہیں جانتے ہمیں کیا

معلوم ہے کہ اگر وُہ اپنے دشمنوں پر قدرت پاتا تو اُن سے کیا سلوک بجا لاتا ۔ اور اگر وُہ دولت مند ہو جاتا تو اس دولت کو جمع کرتا یا لوگوں کو دیتا اور اگر وُہ کسی میدانِ جنگ میں آتا تو دُم دبا کر بھاگ جاتا یا بہادروں کی طرح ہاتھ دِکھاتا۔ مگر خُدا کی عنایت اور فضل نے ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اُن اخلاق کے ظاہر کرنے کا موقعہ دیا۔ چنانچہ سخاوت اور شجاعت اور حِلم اور عفو اور عدل اپنے اپنے موقعہ پر ایسے کمال سے ظہور میں آئے کہ صفحۂ دُنیا میں اسکی نظیر ڈھُونڈنا لاحاصل ہے۔ اپنے دونوں زمانوں میں ضُعف اور قُدرت اور ناداری اور ثروت میں تمام جہان کو دِکھلا دِیا کہ وُہ ذاتِ پاک کیسی اعلیٰ درجہ کے اخلاق کی جامع تھی اور کوئی انسانی خُلق اخلاقِ فاضلہ میں سے ایسا نہیں ہے جو اس کے ظاہر ہونے کیلئے آپ کو خُدا تعالیٰ نے ایک موقعہ نہ دیا۔ شجاعت۔ سخاوت ۔ استقلال ۔ عفو۔ حِلم وغیرہ وغیرہ تمام اخلاقِ فاضلہ ایسے طور پر ثابت ہو گئے کہ دُنیا میں اس کی نظیر کا تلاش کرنا طلبِ محال ہے ۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جنہوں نے ظلم کو اِنتہا تک پہنچا دیا اور اسلام کو نابُود کرنا چاہا۔ خُدا نے اُن کو بھی بے سزا نہیں چھوڑا ۔ کیونکہ ان کو بے سزا چھوڑنا گویا راستبازوں کو اُن کے پَیروں کے نیچے ہلاک کرنا تھا ۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جنگوں کی غرض

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی لڑائیوں کی ہرگز یہ غرض نہ تھی کہ خواہ نخواہ

لوگوں کو قتل کیا جائے۔ وُہ اپنے باپ دادا کے ملک سے نکالے گئے تھے۔ اور بُہت سے مسلمان مرد اور عورتیں بے گُناہ شہید کئے گئے تھے اور ابھی ظالم ظُلم سے باز نہیں آتے تھے اور اسلام کی تعلیم کو روکتے تھے۔ لہٰذا خُدا کے قانونِ حفاظت نے یہ چاہا کہ مظلوموں کو بالکل نابُود ہونے سے بچالے۔ سو جنھوں نے تلوار اُٹھائی تھی اُنھیں کے ساتھ تلوار کا مقابلہ ہُوا۔ غرض قتل کرنے والوں کا فتنہ فرو کرنے کے لئے بطور مدافعتِ شر کے وُہ لڑائیاں تھیں اور اس وقت ہوئیں جب کہ ظالم طبع لوگ اہل حق کو نابُود کرنا چاہتے تھے۔ اس حالت میں اگر اسلام اس حفاظتِ خود اختیاری کو عمل میں نہ لاتا تو ہزاروں بچّے اور عورتیں بے گناہ قتل ہوکر آخر اسلام نابود ہوجاتا۔

یاد رہے کہ ہمارے مخالفین کی یہ بڑی زبردستی ہے کہ وُہ خیال کرتے ہیں کہ الہامی ہدایت ایسی ہونی چاہیئے جس کے کسی مقام اور کسی محل میں دشمنوں کے مقابلہ کی تعلیم نہ ہو۔ اور ہمیشہ حلم اور نرمی کے پیرایہ میں اپنی محبّت اور رحمت کو ظاہر کرے۔ ایسے لوگ اپنی دانست میں خدائے عزّوجلّ کی بڑی تعظیم کررہے ہیں کہ جو اس کی تمام صفاتِ کاملہ کو صرف نرمی اور ملائمت پر ہی ختم کرتے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں فکر اور غور کرنیوالوں پر بآسانی کُھل سکتا ہے کہ یہ لوگ بڑی موٹی اور فاش غلطی میں مُبتلا ہیں۔ خُدا کے قانونِ قُدرت پر نظر ڈالنے سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا کے لئے وُہ رحمتِ محض تو ضرور ہے مگر وُہ رحمت ہمیشہ اور ہر حال میں نرمی اور ملائمت کے رنگ میں ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ سراسر رحمت

کے تقاضا سے طبیب حاذق کی طرح کبھی شربتِ شیریں ہمیں پلاتا ہے۔ اور کبھی دوائی تلخ دیتا ہے۔ اس کی رحمت نوعِ انسان پر اس طرح وارد ہوتی ہے جیسے ہم میں سے ایک شخص اپنے تمام وجود پر رحمت رکھتا ہے۔ اس بات میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ ہر ایک فرد ہم میں سے اپنے سارے وجود سے پیار رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی ہمارے ایک بال کو اُکھاڑنا چاہے تو ہم اس پر سخت ناراض ہوتے ہیں۔ لیکن باوصف اس کے کہ ہماری محبّت جو ہم اپنے وجُود سے رکھتے ہیں ہمارے تمام وجود میں بٹی ہوئی ہے۔ اور تمام اعضاء ہمارے لئے پیارے ہیں۔ ہم کسی کا نقصان نہیں چاہتے۔ مگر پھر بھی یہ بات بداہت ثابت ہے کہ ہم اپنے اعضاء سے ایک ہی درجہ کی اور یکساں محبّت نہیں رکھتے۔ بلکہ اعضائے رئیسہ و شریفہ کی محبّت جن پر ہمارے مقاصد کا بہت کچھ مدار ہے ہمارے دِلوں پر غالب ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہماری نظر میں ایک ہی عضو کی محبّت کی نسبت مجموعۂ اعضاء کی محبت بہت بڑھ کر ہوتی ہے۔ پس جب کبھی ہمارے لئے کوئی ایسا موقعہ آپڑتا ہے کہ ایک عضو کا بچاؤ ادنےٰ درجہ کے عضو کے زخمی کرنے یا کاٹنے یا توڑنے پر موقوف ہوتا ہے تو ہم جان کے بچانے کے لئے بلا تامل اسی عُضو کے زخمی کرنے یا کاٹنے پر مستعد ہو جاتے ہیں اور گو اس وقت ہمارے دِل میں یہ رنج بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے ایک پیارے عضو کو زخمی کرتے یا کاٹتے ہیں۔ مگر اس خیال سے اس عضو کا فساد کسی دوسرے شریف عُضو کو بھی ساتھ ہی تباہ نہ کرے ہم کاٹنے کے لئے مجبور

ہو جاتے ہیں۔ پس اسی مثال سے سمجھ لینا چاہیئے کہ خُدا بھی جب دیکھتا ہے
کہ اس کے راست باز باطل پرستوں کے ہاتھ سے ہلاک ہوتے ہیں اور
فساد پھیلتا ہے تو راست بازوں کی جان کے بچاؤ اور فساد کے فرو کرنے
کے لئے مناسب تدبیر ظہور میں لاتا ہے۔ خواہ آسمان سے خواہ زمین سے
اِس لئے کہ وہ جیسا کہ رحیم ہے ویسا ہی حکیم ہے۔ اَلْحَمْدُ
لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝